ابن آدم

بانو قدسیہ

ابن آدم

جمیلہ اب کینچوے کی طرح کبھی آگے کبھی پیچھے سوچنے لگی تھی۔
کبھی دل میں خیال اٹھتا کہ بے جی کو ان کے کئے کی سزا کیوں نہ ملی؟ اللہ آخری لمحے تک ان پر کیوں مہربان رہا؟ پھر اس خیال پر گہرا پچھتاوا اٹھتا کہ میں بھی کیسی اولاد ہوں، اپنی ماں کے لئے میرے دل میں کیسے برے برے خیال اٹھتے ہیں۔ میں ان کی سزا کے لئے کیسا الٹا ارمان رکھتی ہوں۔

ایسے میں جمیلہ احساس جرم تلے پستی، اپنے سے جھگڑتی اور پھر جھلا جھل فرافر آنسو اس کے گالوں پر پھیلتے۔ بہت سال سے دولت کی ریل پیل نے اس کے مسائل آسان کر دیے تھے اور آنسو وافر تعداد میں یوں نہ بہتے تھے.....

لیکن بے جی کو معاف نہ کر سکنے پر اس کے دل میں اپنے ہی خلاف غم و غصے کی جو کیفیت اٹھتی، اس پر بھی اسے اختیار نہ تھا۔ ایسے میں اپنے آپ کو کوستی، ماں جی پر ترس کھاتی تو بے تحاشا آنسو فرش پر گرنے لگتے۔ احساس جرم فتنہ پرور اسے پینے لگتا۔

تب بھی سنگ مرمر کے چکنے فرش پر جابجا جمیلہ کے آنسو بوند بوند پھیلے تھے۔ شاہد دفتر جانے لگا تو ڈریسنگ ٹیبل کے قریب بریف کیس رکھتے ہوئے اس نے پوچھا: "یہ فرش پر پانی کے قطرے کیسے ہیں، جمیلہ؟"

جمیلہ، تین جوان بچوں کی ماں، چپ چاپ پلنگ پر لیٹی رہی۔ برسوں سے وہ ناشتے کی میز پر نہ جاتی تھی۔ شاہد کب اور کیسے تیار ہو کر بزنس آفس جاتا، اس کی اسے خبر نہ تھی۔

"اپنے پیارے ملازموں سے کہئے جب پانی اندر لائیں تو احتیاط برتیں۔ فرش کی

ساری خوبصورتی ذرا سی گرد اور تھوڑے سے پانی سے برباد ہو جاتی ہے۔" شاہد کے نتھنے پھڑپھڑائے۔ وہ خشکی باز نہیں تھا لیکن ذرا سی کشیدگی میں اس کے نتھنے نمونیا کے مریض کی طرح لرزنے لگتے.... اس نے بریف کیس اٹھایا اور رُوکھا سا بغیر سلام دعا کے رخصت ہو گیا۔

اصل میں شاہد کا مسئلہ بھی سنگ مرمر پر پانی کے چھینٹوں کا نہیں تھا۔ وہ بھی اپنی تجویزوں کے گرداب میں گھمن گھیری کھا رہا تھا۔ اس کا بزنس ایک عرصے سے کامیابی کی رکاب پکڑے سرپٹ بھاگتا رہا۔ وہ ایک فیکٹری سے دوسری کی جانب بڑے حوصلے اور ثابت قدمی سے بڑھا۔ جاپان اور جرمنی کی کئی فرموں سے اس کا بزنس چل رہا تھا۔ اس وقت اس کی بارہ فیکٹریاں اور کئی پلازے تعمیر ہو چکے تھے۔ پھر وہ سٹاک ایکسچینج کا ممبر بھی تھا، وہاں کی آمدنی بے تحاشا تھی۔ سی این این پر وہ کئی بار بزنس نیوز کا حصہ بن چکا تھا۔

جمیلہ ہر طرح سے اس کی نصف بہتر تھی۔ جو نیا فیشن کروٹ لیتا، وہ کاروباری طبقے میں سب سے پہلے رہن سہن اور آرائش بدل کر صف اول میں آ جاتی۔ سال بھر پہلے جب جمیلہ نے چپس کے پختہ فرش تڑوا کر سارے گھر میں اطالوی سنگ مرمر لگوایا تو شاہد کا ملٹی نیشنل بزنس ٹھیک ٹھاک تھا۔ سنگ مرمر بچھانے کی بظاہر وجہ یہ تھی کہ صاف ستھرے فرش پولیوشن فری ہوتے ہیں جبکہ قالینوں سے ڈھکے فرشوں سے گرد اٹھتی ہے جو بالکل ہائی جینک نہیں.... درپردہ وجہ سٹیٹس تھی۔ جمیلہ اپنے شوہر کی حیثیت کا خوب خیال رکھتی تھی۔

سارے فرش لگ چکنے کے بعد چھوٹے چھوٹے ایرانی، پاکستانی، چینی قالین کمروں میں بچھائے گئے۔ کرسٹل کے چھوٹے بڑے ڈیکوریشن پیس اٹھا دیئے گئے۔ پیتل اور کانسی کے پرانے برتن، لکڑی کی چترالی بنچیں، سندھ کی رلی، بلوچستان کی شیشے جڑاؤ چادریں، کافرستان کے دروازے جابجا سجائے گئے۔ گھر کو محل کی طرح نوادرات کی مدد کے ساتھ نئے اور پرانے کے امتزاج سے میوزیم کی طرح پڑ ہول بنایا گیا جہاں پہنچ کر زائرین کا منہ کھلے کا کھلا رہ جاتا ہے۔

کرسٹل اور چپس کا عہد گزر گیا۔

لیکن جمیلہ اور اس کے کامیاب شوہر کو علم نہ تھا کہ انسان بھی کبھی کبھی وقت گزرنے پر ان فیشن نہیں رہ سکتا۔ اس کی کامیابی کا عہد بھی گزر جاتا ہے۔ جب جمیلہ کا گھر

میوزیم بن گیا تو پتہ نہیں کیوں اور کیسے شاہد کے حالات نے بھی پلٹا کھایا.... وہ اپنے میوزیم سے محل میں کسی گزرے عہد کا فرعون نظر آنے لگا۔ پہلے لیو کمپنی نے اس کے کاروبار سے سارا اثاثہ نکال لیا۔ پھر جرمنی کے طاقتور تاجر ہول برگ سے جھگڑا ہوا۔ تقریباً دس ملین کا سالانہ کاروبار چل رہا تھا، اب اسی قدر رقم آپس کے مقدمے میں صرف ہونے لگی۔ بارشوں کے تسلسل نے گلبرگ والے پلازے کی کمر توڑ دی۔ ایک روز چوتھی منزل کی چھت رات کے پچھلے پہر جواب دے گئی۔ سارا پلازا اپنے وزن سے چور چور ہو گیا۔ دکانداروں نے چھوٹے موٹے مقدمے تو کھڑے کئے ہی تھے، شاہد کا کروڑوں کا سامان جو تہ خانے میں دھرا تھا، ملبہ بن گیا۔

شاہد ساری عمر کامیابی کا مکٹ سجائے تجویز کا حامی، عقل کا پیروکار رہا۔ پے در پے کامیابیوں نے اسے اپنی قوت پر اعتماد کرنا سکھایا تھا۔ ہر تجویز کار آمد، پلاننگ بے مثل، ہائیر اینڈ فائر کی پالیسی درست۔ مایا داس کی طرح وہ جس چیز کو ہاتھ لگاتا، سونا بن جاتی۔ سوچتا رہ گیا کہ آخر یہ ناکامی کی چیونٹی کہاں سے ہاتھی کی سونڈ میں داخل ہوئی۔ اسے ابرہہ پر گرنے والی کنکریوں کے سرچشمے کی تلاش تھی.... ساری کاروباری برادری کا خیال تھا کہ معاشی معاملات میں مارکیٹ کی سمجھ، پیسہ انوسٹ کرنے اور بیچنے خریدنے میں شاہد کی چھٹی حس اور اس کی فراست کا کوئی مدمقابل نہیں۔ مدھم رنگ، اوسط پڑھائی، درمیانے قد کا شاہد خود اپنے آپ کو Genius سمجھتا تھا۔ اسے اپنے تجربے پر بڑا مان تھا۔ بظاہر اس کی گفتگو میں حلم اور انکساری تھی لیکن درپردہ وہ شیخی باز، متکبر اور خودبین تھا۔ اس کی کامیابی نے اس کی [illegible] بہت پھل دار کر دیا تھا اور چھوٹی نارنگیوں کے پیڑ کی طرح اس کی ساری گفتگو "[illegible]" سے لدی تھی۔ جب بھی وہ بات کرتا، کوئی جملہ کسی اور سے متعلق نہ ہوتا۔ میرا [illegible] میرا فیلڈ ورک.... میری پلاننگ.... میری چھٹی حس.... میری سیانپ.... وہ اونچی [illegible] زیادہ گفتگو کرنے کا عادی تھا۔ بس چھوٹے چھوٹے اشاروں سے گذشتہ [illegible] تھوڑا تھوڑا وزن ڈال کر اپنے آپ کو نابغہ روزگار ثابت کرنے [illegible]

[illegible] روز [illegible] پٹرول پمپ میں آگ لگی، شاہد بہت اداس تھا۔ اسی روز [illegible] ملین کا [illegible] لیا۔ تینوں بچوں نے بھی لندن سے واپس آنے سے

انکار کر دیا۔ اس دن شاہد کی انا کا غبارہ بری طرح پنکچر ہوا۔ اس نے مین ہال وے میں صوفے کے پاس فرش ہی پر بریف کیس رکھ دیا اور اطالوی صوفے پر سر ٹیک کر خالی الذہن ہونے کی کوشش کی۔

جمیلہ اس پُر اعتماد شخص کو یوں دیکھنے کی عادی نہ تھی۔

"کیا ہوا شاہد؟"

"کچھ نہیں..... بس۔" شاہد برسوں کے بعد رونا چاہتا تھا۔ "ایک اور نقصان۔" وہ منمنایا۔

"پھر بھی کچھ تو بتائیں؟....." جمیلہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔ برسوں کی کامیابی نے ان میں ایسی یخ بستہ دوری پیدا کر دی تھی کہ وہ شاہد کا ہاتھ نہ پکڑ سکی۔

"نسبت روڈ والے پٹرول پمپ میں آگ لگ گئی۔" وہ جمیلہ کے اس قدر قریب نہ تھا کہ اسے ہول برگ والے مقدمے کا بھی بتا سکتا۔

جمیلہ کا رنگ پیلا پڑ گیا..... ابھی دوپہر کی ڈاک سے بچوں کا خط اسے ملا تھا اور وہی دھکا اس کے لئے کافی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بچوں والی بات شاہد کو معلوم نہیں، حالانکہ بچے فون پر ابو سے بات کر چکے تھے کہ وہ واپس آنا نہیں چاہتے۔

وہ گم صم شاہد کے پاس بیٹھی رہی۔ ان دونوں کے درمیان ایسی برف کی حدود قائم ہو چلی تھیں کہ کسی بے ساختگی، تجاوزات، من مانی کی گنجائش نہ تھی..... خاموشی کا لمحہ [illegible]

"[illegible] پیلے دیا شاہد، وہ پھر دے گا..... وہاں دیر ہے، اندھیر نہیں۔"

[illegible] تپ گیا "تم ہر بات میں اپنے اللہ کو بیچ میں نہ لایا کرو..... یہ [illegible]

[illegible] تسلی [illegible] ہے....."

[illegible] دیکھی نہیں جاتی تھی۔ اسے [illegible] شاہد کا سر اپنے سینے سے لگا لے، [illegible] تسلی، نصیحت یا [illegible] اب ناکامی میں کئی [illegible] ایک انتہائی [illegible]

کی اور شاہد کا غم غلط کرنے اور اس کا دھیان بٹانے کی خاطر اس کے منہ سے نکلا: "شاہد! رزق اور عزت کا وہی ضامن ہے۔ رزق میں بڑھوتری ہو کہ گھاٹا ٹوٹا سب اس کی طرف سے ہے۔ ہم کمزور گوشت پوست سے بنے لوگ اتنا وزن کیسے اٹھا سکتے ہیں؟ اس کی پناہ لو شاہد، اس پر وزن ڈالو۔"

شاہد بھڑک کر اٹھ بیٹھا۔ "تم ایسی باتیں کر سکتی ہو جمیلہ کیونکہ تم نے محنت نہیں کی، تم نے میری محنت کا ثمر کھایا ہے..... میں اپنی ساری محنت، تجویز، ہمت کو کیسے بھول جاؤں؟ یہاں تک پہنچنے میں مجھے جو کچھ برداشت کرنا پڑا..... جو مشکلات، ذلتیں، کٹھنائیاں میں نے برداشت کیں..... میری ان تھک کوشش..... وہ..... سب اکارت گئی....."

جمیلہ عام طور پر گفتگو کو مناظرے میں بدلنے سے پہلے خاموش ہو جایا کرتی تھی، پر اچانک اس کے منہ سے نکلا..... "کوئی شخص از خود نہ تجویز کر سکتا ہے نہ کوشش..... تمہارے پلان، کوشش، تجویز، اللہ کی عطا تھی..... اس نے چاہا تو تمہیں کام کی توفیق ملی، نہ چاہتا تو....." یکدم شاہد کا چہرہ دیکھ کر وہ چپ ہو گئی۔

"مجھے فلسفہ نہیں چاہیے۔ مجھے کسی مولانا صاحب کا دینی لیکچر بھی درکار نہیں۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں..... میں ہی کیوں؟..... اتنی شکست، تباہی و ناکامی کے لئے صرف مجھے کیوں چنا گیا؟"

جمیلہ کم گو تھی، اس کے حسن نے عموماً اسے بڑی مراعات بغیر جھگڑے بہم پہنچائی تھیں۔ وہ تند آواز میں بولی..... "شاہد! جو لوگ اپنے ہر عمل کی سزا بھگتنے کو تیار ہوں، وہی یہ [illegible] وال پوچھ سکتے ہیں کہ "میں ہی کیوں؟" جہاں کامیابی کا سہرا اپنے سر اور ناکامی کا الزام [illegible] پر [illegible] وہاں "میں ہی کیوں" نہیں پوچھا جا سکتا۔ ہم لوگ انا کے مارے، شیخی [illegible] نہیں تو کوئی بڑا "قربانی کا بکرا" چاہیے، بڑی کھونٹی جس پر ہم اپنی ناکامی کا بھاری [illegible] لٹکا سکیں [illegible] اس قدر مضبوط نہ ہو شاہد! وہی دولت دیتا ہے، وہی عزت عطا کرتا ہے [illegible] اپنے اعمال [illegible] نصیبی کا بوجھ اس پر ڈال کر تو دیکھو..... یہ فیز نکل جائے گا۔ یہ بڑا [illegible] ختم ہو جائے گا..... ہماری کوشش ضمنی ہے۔ وہ پھر توفیق دے گا۔ بڑی ریل پیل ہو [illegible]"

[illegible] شاہد نے زور سے مکا مارا۔ بڑے دھماکہ خیز سُروں نے سارا

انکار کر دیا۔ اس دن شاہد کی انا کا غبارہ بری طرح پنکچر ہوا۔ اس نے مین ہال وے میں صوفے کے پاس فرش ہی پر بریف کیس رکھ دیا اور اطالوی صوفے پر سر ٹیک کر خالی الذہن ہونے کی کوشش کی۔

جمیلہ اس پُر اعتماد شخص کو یوں دیکھنے کی عادی نہ تھی۔

"کیا ہوا شاہد؟"

"کچھ نہیں..... بس۔" شاہد برسوں کے بعد رونا چاہتا تھا۔ "ایک اور نقصان۔" وہ منمنایا۔

"پھر بھی کچھ تو بتائیں؟....." جمیلہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔ برسوں کی کامیابی نے ان میں ایسی یخ بستہ دوری پیدا کر دی تھی کہ وہ شاہد کا ہاتھ نہ پکڑ سکی۔

"نسبت روڈ والے پٹرول پمپ میں آگ لگ گئی۔" وہ جمیلہ کے اس قدر قریب نہ تھا کہ اسے ہول برگ والے مقدمے کا بھی بتا سکتا۔

جمیلہ کا رنگ پیلا پڑ گیا..... ابھی دوپہر کی ڈاک سے بچوں کا خط اسے ملا تھا اور وہی دھکا اس کے لئے کافی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بچوں والی بات شاہد کو معلوم نہیں، حالانکہ بچے فون پر ابو سے بات کر چکے تھے کہ وہ واپس آنا نہیں چاہتے۔

وہ گم صم شاہد کے پاس بیٹھی رہی۔ ان دونوں کے درمیان ایسی برف کی حدود قائم ہو چکی تھیں کہ کسی بے ساختگی، تجاوزات، من مانی کی گنجائش نہ تھی..... خاموشی کا لمحہ [illegible] گزرا۔

"[illegible] دیا شاہد، وہ پھر دے گا..... وہاں دیر ہے، اندھیر نہیں۔"

[illegible] تپ گیا۔ "تم ہر بات میں اپنے اللہ کو بیچ میں نہ لایا کرو..... یہ [illegible] تسلی ہے....."

[illegible] سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ اسے [illegible] شاہد کا سر اپنے سینے سے لگا لے، [illegible] تسلی، نصیحت یا [illegible] اب ناکامی میں کل [illegible] ایک اعتماد [illegible]

کی اور شاہد کا غم غلط کرنے اور اس کا دھیان بٹانے کی خاطر اس کے منہ سے نکلا: "شاہد! رزق اور عزت کا وہی ضامن ہے۔ رزق میں بڑھوتری ہو کہ گھاٹا، ٹوٹا سب اس کی طرف سے ہے۔ ہم کمزور گوشت پوست سے بنے لوگ اتنا وزن کیسے اٹھا سکتے ہیں؟ اس کی پناہ لو شاہد، اس پر وزن ڈالو۔"

شاہد بھڑک کر اٹھ بیٹھا۔ "تم ایسی باتیں کر سکتی ہو جمیلہ کیونکہ تم نے محنت نہیں کی، تم نے میری محنت کا ثمر کھایا ہے..... میں اپنی ساری محنت، تجویز، ہمت کو کیسے بھول جاؤں؟ یہاں تک پہنچنے میں مجھے جو کچھ برداشت کرنا پڑا..... جو مشکلات، ذلتیں، کٹھنائیاں میں نے برداشت کیں..... میری ان تھک کوشش..... وہ..... سب اکارت گئی....."

جمیلہ عام طور پر گفتگو کو مناظرے میں بدلنے سے پہلے خاموش ہو جایا کرتی تھی، پر اچانک اس کے منہ سے نکلا..... "کوئی شخص از خود نہ تجویز کر سکتا ہے نہ کوشش..... تمہارے پلان، کوشش، تجویز، اللہ کی عطا تھی..... اس نے چاہا تو تمہیں کام کی توفیق ملی، نہ چاہتا تو....." یکدم شاہد کا چہرہ دیکھ کر وہ چپ ہو گئی۔

"مجھے فلسفہ نہیں چاہیے۔ مجھے کسی مولانا صاحب کا دینی لیکچر بھی درکار نہیں۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں..... میں ہی کیوں؟..... اتنی شکست، تباہی و ناکامی کے لئے صرف مجھے کیوں چنا گیا؟"

جمیلہ کم گو تھی، اس کے حسن نے عموماً اسے بڑی مراعات بغیر جھگڑے بہم پہنچائی تھیں۔ وہ تند آواز میں بولی..... "شاہد! جو لوگ اپنے ہر عمل کی سزا بھگتنے کو تیار ہوں، وہی یہ سوال پوچھ سکتے ہیں کہ "میں ہی کیوں؟" جہاں کامیابی کا سہرا اپنے سر اور ناکامی کا الزام [illegible] وہاں "میں ہی کیوں" نہیں پوچھا جا سکتا۔ ہم لوگ انا کے مارے، شیخی [illegible] ہمیں تو کوئی بڑا "قربانی کا بکرا" چاہیے، بڑی کھونٹی جس پر ہم اپنی ناکامی کا بھاری [illegible] لٹکا سکیں [illegible] اس قدر مضبوط نہ ہو شاہد! وہی دولت دیتا ہے، وہی عزت عطا کرتا ہے۔ تم اپنے اعمال کا بدنصیبی کا بوجھ اس پر ڈال کر تو دیکھو..... یہ فیز نکل جائے گا۔ یہ بُرا [illegible] تم [illegible] جائے گا..... ہماری کوشش ضمنی ہے۔ وہ پھر توفیق دے گا۔ بڑی ریل پیل ہو [illegible]"

[illegible] شاہد نے زور سے مکا مارا۔ بڑے دھماکہ خیز سُروں نے سارا

انکار کر دیا۔ اس دن شاہد کی انا کا غبارہ بری طرح پنکچر ہوا۔ اس نے مین ہال وے میں صوفے کے پاس فرش ہی پر بریف کیس رکھ دیا اور اطالوی صوفے پر سر ٹیک کر خالی الذہن ہونے کی کوشش کی۔

جمیلہ اس پُر اعتماد شخص کو یوں دیکھنے کی عادی نہ تھی۔

"کیا ہوا شاہد؟"

"کچھ نہیں..... بس۔" شاہد برسوں کے بعد رونا چاہتا تھا۔ "ایک اور نقصان۔" وہ منمنایا۔

"پھر بھی کچھ تو بتائیں؟....." جمیلہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔ برسوں کی کامیابی نے ان میں ایسی یخ بستہ دوری پیدا کر دی تھی کہ وہ شاہد کا ہاتھ نہ پکڑ سکی۔

"نسبت روڈ والے پٹرول پمپ میں آگ لگ گئی۔" وہ جمیلہ سے اس قدر قریب نہ تھا کہ اسے ہول پرک والے مقدمے کا بھی بتا سکتا۔

جمیلہ کا رنگ پیلا پڑ گیا..... ابھی دوپہر کی ڈاک سے بچوں کا خط اسے ملا تھا اور وہی دھکا اس کے لئے کافی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بچوں والی بات شاہد کو معلوم نہیں۔ حالانکہ بچے فون پر ابو سے بات کر چکے تھے کہ وہ واپس آنا نہیں چاہتے۔

وہ گم صم شاہد کے پاس بیٹھی رہی۔ ان دونوں کے درمیان ایسی برف کی حدود قائم ہو چکی تھیں کہ کسی بے ساختگی، تجاوزات، من مانی کی گنجائش نہ تھی..... لمحہ، ثانیہ صدیاں بن کر گزرا۔

"جس نے پہلے دیا شاہد، وہ پھر دے گا..... وہاں دیر ہے، اندھیر نہیں۔"

شاہد سارے کا سارا تڑپ گیا۔ "تم ہر بات میں اپنے اللہ کو بیچ میں نہ لایا کرو..... یہ مولوی پنا چھوڑ دو جمیلہ! یہ سب طفل تسلی ہے....."

اس کامیاب کاروباری شخص کی ناکامی جمیلہ سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ اسے اس گھڑی لندن والے بچے بھول گئے۔ اس کا جی چاہا کہ شاہد کا سر اپنے سینے سے لگا لے، لیکن شاہد کی سطح کے یاس زدہ آدمی کو کسی معمولی شک زیست کی طرح تسلی، نصیحت یا تلقین نہیں کی جا سکتی۔ شاہد جس طرح کامیابی میں بے عدیل تھا ویسے ہی اب ناکامی میں کلی طور پر تن تنہا تھا۔ لیکن جمیلہ پر نہ جانے کیا گزری..... اس وقت اس نے ایک انتہائی غلطی

کی اور شاہد کا غم غلط کرنے اور اس کا دھیان بٹانے کی خاطر اس کے منہ سے نکلا: "شاہد! رزق اور عزت کا وہی ضامن ہے۔ رزق میں بڑھوتری ہو کہ گھاٹا، ٹوٹا سب اس کی طرف سے ہے۔ ہم کمزور گوشت پوست سے بنے لوگ اتنا وزن کیسے اٹھا سکتے ہیں؟ اس کی پناہ لو شاہد، اس پر وزن ڈالو۔"

شاہد بھڑک کر اٹھ بیٹھا۔ "تم ایسی باتیں کر سکتی ہو جمیلہ کیونکہ تم نے محنت نہیں کی، تم نے میری محنت کا ثمر کھایا ہے..... میں اپنی ساری محنت، تجویز، ہمت کو کیسے بھول جاؤں؟ یہاں تک پہنچنے میں مجھے جو کچھ برداشت کرنا پڑا..... جو مشکلات، ذلتیں، کٹھنائیاں میں نے برداشت کیں..... میری ان تھک کوشش..... وہ..... سب اکارت گئی....."

جمیلہ عام طور پر گفتگو کو مناظرے میں بدلنے سے پہلے خاموش ہو جایا کرتی تھی، پر اچانک اس کے منہ سے نکلا..... "کوئی شخص از خود نہ تجویز کر سکتا ہے نہ کوشش..... تمہارے پلان، کوشش، تجویز، اللہ کی عطا تھی..... اس نے چاہا تو تمہیں کام کی توفیق ملی، نہ چاہتا تو....." یکدم شاہد کا چہرہ دیکھ کر وہ چپ ہو گئی۔

"مجھے فلسفہ نہیں چاہیے۔ مجھے کسی مولانا صاحب کا دینی لیکچر بھی درکار نہیں۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں..... میں ہی کیوں؟..... اتنی شکست، تباہی و ناکامی کے لئے صرف مجھے کیوں چنا گیا؟"

جمیلہ کم گو تھی، اس کے حسن نے عموماً اسے بڑی مراعات بغیر جھگڑے بہم پہنچائی تھیں۔ وہ تند آواز میں بولی..... "شاہد! جو لوگ اپنے ہر عمل کی سزا بھگتنے کو تیار ہوں، وہی یہ سوال پوچھ سکتے ہیں کہ "میں ہی کیوں؟" جہاں کامیابی کا سہرا اپنے سر اور ناکامی کا الزام دوسروں پر ہو وہاں "میں ہی کیوں" نہیں پوچھا جا سکتا۔ ہم لوگ انا کے مارے، شیخی خورے، ہمیں تو کوئی بڑا "قربانی کا بکرا" چاہیے، بڑی کھونٹی جس پر ہم اپنی ناکامی کا بھاری اوور کوٹ ٹانک سکیں۔ اس قدر مضبوط نہ ہو شاہد! وہی دولت دیتا ہے، وہی عزت عطا کرتا ہے۔ تم اپنے اعمال کا، بدنصیبی کا بوجھ اس پر ڈال کر تو دیکھو..... یہ تیر نکل جائے گا۔ یہ بڑا وقت ختم ہو جائے گا..... ہماری کوشش ضمنی ہے۔ وہ پھر توفیق دے گا۔ بڑی ریل پیل ہو گی۔"

کھلے پیانو کے سروں پر شاہد نے زور سے مکا مارا۔ بڑے دھماکہ خیز سُروں نے سارا

گھر بھر دیا۔

"وہ..... وہ تمہارا خدا پلازے بنانے آیا تھا؟ اسٹاک ایکسچینج پر وہ کام کرتا ہے؟ رات دن فیکٹریاں تمہارا رب چلاتا ہے؟ وہ بال سفید کرتا ہے اپنے سوچ سوچ کر؟... ٹھیک ہے گفتگو میں سارا کریڈٹ میں تمہارے خدا ہی کو دیتا ہوں، لیکن ڈونٹ فارگیٹ میں نے اتنی محنت کی ہے، اتنی محنت کی ہے....."

شاہد نے منہ دیوار کی طرف کر لیا۔ جمیلہ اس کا چہرہ دیکھنا بھی نہ چاہتی تھی۔ اس کے دل میں شاہد کے حصے کی معافیاں بھی گڑگڑانے لگیں.... "اللہ جی! یہ ناکامی کی آخری چٹان پر کھڑا ہے۔ اسے اس دیوانگی کی سزا نہ دینا پروردگار..... یہ سزا کا مستحق بھی ہو تو اسے اللہ میاں جی صرف معاف ہی نہ کرنا بلکہ..... جزا دینا.. اس کے دن پھیر دینا... اس کی تجویزوں نے، اس کی محنت نے اسے چھوٹا سا فرعون بنا دیا ہے..... جو ہر کامیابی کو اپنے سے منسوب کرتا ہے.... میرے مولا! اس Genius کو فرعون ہونے کی سزا نہ دینا۔ اسے ناکامی کے دریا میں ڈبو نہ دینا میرے آقا...."

اس روز کے مناظرے نے جمیلہ اور شاہد کے فاصلے کچھ اور بڑھا دیے۔ دونوں سوشل فنکشنوں پر پاس پاس اور تنہائی میں ایک دوسرے سے دور دور رہتے تھے۔ شاہد نے ایک بڑا سہارا ٹھکرا کر اور سارے الزامات اپنے سر لے کر اپنے آپ کو کوسنا شروع کر دیا۔ کس وقت میں نے کون سی غلطی کی، کہاں چوک ہوئی، کون سے فیصلے غلط کئے؟ وہ ایک بار پھر اپنی انا کے چھلاوے کے آگے احساسِ جرم میں سر جھکائے کھڑا تھا۔ ناکامی سے دوچار ہو کر وہ اپنے رب سے ناراض ہو گیا۔ لاڈلے بیٹے کی طرح اپنی من مانی کرتے رہنے کے بعد اس کا یہ خوف بھی جاتا رہا کہ اسے عاق بھی کیا جا سکتا ہے!

جمیلہ کو پتہ نہیں کیوں یقین تھا کہ اولاد نافرمان بھی ہو اور ناشکر گزار بھی لیکن دنیاوی والدین کی طرح اللہ اپنی مخلوق کو کبھی عاق نہیں کرتا۔ جمیلہ اور شاہد جب بیڈ روم میں اکیلے ہوتے تو ان کی خاموشی کے "لاکر" ہمیشہ دو کنجیوں سے کھلتے..... ایک ساتھی کی رضامندی، دوسری اپنی منشا... ان دو چابیوں نے خاموشی کے لمحے بڑے لمبے کر دیے تھے۔ خاموشی کے زحمتی دور سے نبرد آزما ہو کر ایک دن شاہد بولا: "اسٹاک ایکسچینج کا اس حکومت نے بھٹہ بٹھا دیا..... جو شیئر سو کا تھا اب دس پہ ہے..... میرا ارادہ ہے کہ کینیڈا

کی امیگریشن لے لوں۔ اب یہاں ساکھ بحال نہیں ہو گی جمیلہ....."

"بیٹیاں لندن بیاہی گئیں، بیٹا امریکہ میں پڑھ رہا ہے۔ آپ کینیڈا چلے ہیں؟ آپ کو جانا ہی ہے تو لندن چلے جائیں...."

"لندن تو ایسی کساد بازاری میں جا رہا ہے کہ اللہ بچائے.... تم میرا ساتھ نہ دینا چاہو تو نہ سہی۔ میری تو قسمت ساتھ چھوڑ گئی، تم کس شمار میں!"

"نہیں ابھی بھی کسی چیز کی کمی نہیں شاہد! گاڑیاں، کوٹھی، پیسے کی ریل پیل۔ اس بڑھاپے میں ہم کیوں جلا وطن ہوں؟ اللہ میاں سب ٹھیک کر دے گا شاہد!"

وہ اس خیر خواہی سے بھڑک گیا۔ "مہربانی فرما کر آپ اللہ میاں کی سفارش نہ کریں۔ آپ کا اللہ میاں کبھی آدمی تو رہا نہیں کہ وہ جان سکے جب انسان اپنے ہم چشموں میں ذلیل ہو جاتا ہے تو اس کے دل پر کیا گزرتی ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو تھانیدار کے حواری بھی ہوں اور جیل بھی بھگتیں.... شادی بھی تیلی سے کریں اور کھائیں بھی سوکھی.... پیارے بھی ہوں اللہ کے اور ذلت بھی سہیں..... نو تھینک یو.... نو تھینک یو..... میں ایسے محبوب سے تنہا ہی بھلا۔ میں دوستی میں آزمائش کا قائل نہیں.... میں اگر کامیابی میں تنہا تھا تو ناکامی میں بھی اکیلا رہوں گا۔"

پتہ نہیں یہ ڈھٹائی تھی کہ برسوں کی رفاقت... جمیلہ نے جرأت کر کے کہا: "شاہد! ہر معاملے میں تم مجھ سے بہتر جانتے ہو۔ تمہیں بتانے کی تو ضرورت نہیں لیکن شاید بات کا اعادہ کرنے سے کچھ فرق پڑ جائے۔ بھلا روزِ ازل کیا ہوا تھا! لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید ابلیس کا گناہ فقط تکبر ہے.... لیکن میرا خیال ہے کہ تکبر کا حاصل مایوسی ہے۔ جب ابلیس اس بات پر مصر ہوا کہ وہ مٹی کے پتلے کو سجدہ نہیں کر سکتا تو وہ تکبر کی چوٹی پر تھا لیکن جب تکبر ناکامی سے دوچار ہوا.... تو ابلیس اللہ کی رحمت سے ناامید ہوا..... حضرت آدمؑ بھی ناکام ہوئے، وہ بھی جنت سے نکالے گئے لیکن وہ مایوس نہیں ہوئے.... یہی تو ساری بات ہے۔ شاہد! ابلیس نے دعویٰ کر رکھا ہے میں تیری مخلوق کو تیری رحمت سے مایوس کروں گا۔ ناامید، مایوس لوگ میرے گروہ میں داخل ہوں گے.... اللہ جانتا ہے کہ اس کے چاہنے والوں کا اغوا ممکن نہیں۔ وہ کنوئیں میں لٹکائے جائیں، آگ پر جلائے جائیں، صلیب پر لٹکیں لیکن وہ مایوس نہیں ہوں گے...."

وہ کچھ دیر ہنستا رہا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے لگے.... پھر وہ طنز بھری آواز میں بولا: "اسی لئے میں آپ کو منع کرتا تھا کہ درس لینے نہ جایا کریں لیکن آپ کو اپنے وقت کا کوئی بہتر مصرف نہیں سوجھا۔ اب آپ کی شخصیت ایسی ہو گئی ہے جیسے کسی مولوی نے دوپٹہ اوڑھ رکھا ہو۔ آپ وہاں موجود تھیں جب ابلیس اور اللہ کے درمیان امید کا ڈایلاگ ہوا؟ پہلے آپ نے فلسفہ پڑھا، اب دینی رسائل اور ان ہفتہ وار درسی لیکچروں نے آپ کا بیڑا غرق کر دیا۔ پہلے میں بھی تکلیف کے وقت اللہ کو پکارا کرتا تھا، لیکن اب نہیں.... اب میں جانتا ہوں کہ میرے فیصلوں نے مجھے کامیاب بنایا اور میرے ہی فیصلوں نے مجھے ناکام کر دیا۔ اس میں کسی سپر نیچرل فیکٹر کو دخل نہیں۔ جو لوگ اولاد کے لئے اور اپنے لیے درست فیصلے کرتے ہیں، انہیں ناکامی کا منہ نہیں دیکھنا پڑتا۔ میں نے ضرور کہیں کوئی بڑی غلطی کی ہے.... جس طرح کچھ احمق اچھی تعلیم دیئے بغیر اولاد کو معاشرے میں چھوڑ کر پچھتاتے ہیں.... ایسے ہی کہیں میں نے کچھ کیا.... کوئی غلط فیصلہ، کوئی ناکام پلاننگ...."

"اگر آپ اس انا کا پیچھا چھوڑ دیں، تو شاید.... باجی نے کن مصیبتوں سے اپنے بیٹوں کو ڈاکٹر بنایا.... چار سال سے بیکار بیٹھے ہیں اسلم اور سلیم۔ کبھی تو سوچ لیا کریں انسانی تجویز کے علاوہ کوئی اور فیکٹر بھی ہو سکتا ہے۔ کہیں نہیں انسانی تجویز اچانک کیوں فیل ہو جاتی ہے شاہد! سوچا کریں.... غور کیا کریں۔"

"واہ جی واہ! یعنی تم اتنی احمق ہو کہ اپنے خدا کو اب بے انصاف بنانے پر تلی ہوئی ہو.... یعنی تمہارے رب کو یہ بھی علم نہیں ہوتا کہ اتنی کڑی محنت کا کچھ اجر بھی ہونا چاہیے۔ ہم سرمایہ دار ہی تمہارے رب سے بہتر ہیں جو محض اس کے حکم کو سن کر پسینہ خشک ہونے سے پہلے مزدوری ادا کرتے رہتے ہیں.... پہلے حکم سن کر ایسے کرتے تھے، اب ہیومن رائیٹ سمجھ کر کرتے ہیں۔"

یہ باتیں سن کر جمیلہ خاموش ہو گئی۔ معاً اسے خیال آیا کہ وہی شاہد سے بحث کر کے یہ کفر کے کلمے کہلوا رہی ہے۔ جی ہی جی میں معافیاں مانگتی وہ غسل خانے کی جانب چلی۔ آنسو جو اس کی آنکھوں سے نکلے، سنگ مرمر کے فرش پر چھینٹے ڈالتے گئے

لاکر دونوں کی خاموشی سے ایک عرصہ تک بند رہا....

پھر اچانک ایک واقعہ رونما ہوا۔ ایک ملٹی نیشنل فرم کے مالک نجم رضوان کے گھر ایک دعوت پر جانا پڑا۔ نجم اس قدر امیر تھا کہ اسے کسی حجاب کی ضرورت نہ رہی تھی۔ اس چیڑ قناتے، چپوڑے کی تمام اچھی اور بری عادتیں اب سب کے سامنے تھیں۔ وہ اپنی کمینگی، ہرزہ گوئی، جھوٹ اور بے پر کی داستانیں سنا سنا کر لوگوں کو حیران کرتا رہتا تھا.... اس کی دولت نے اسے لائسنس دے رکھا تھا کہ وہ جنسی لطیفوں سے لے کر ٹیکس کی چوری کے قصے تک محفلوں میں بڑے تکبر سے سنائے۔

اس دعوت کے بعد مشہور و معروف گلوکار فقیر حسین کا گانا تھا۔ اس گائیک کی شہرت ملک اور بیرون ملک جنگل کی آگ بن کر پھیل رہی تھی۔ امریکہ، یورپ، انگلستان، دوحہ، شارجہ، دبئی کون سا ملک تھا جو اس نے اپنی آواز کے جادو سے فتح نہ کیا۔ غزل، نیم کلاسیکی گیت، ٹھمری، دادرا، خیال سبھی قسم کی موسیقی پر حاوی تھا۔ اس کی مانگ کا یہ عالم تھا کہ اس سے تاریخ لینے کے لئے کئی کئی مہینے انتظار کرنا پڑتا۔ اس کا سودائی سا مینیجر اب تین لاکھ روپے فی فنکشن پہلے وصول کرنے لگا تھا۔ پھر فقیر حسین فنکشن کے دوران کسی کی فرمائش قبول نہ کرتا۔ وہ اور اس کے سازندے ہمیشہ فائیو سٹار ہوٹل میں رہتے۔ فنکشن کرانے والوں کو حکم ملتا کہ فقیر حسین کے لئے دیسی گھی میں کھانا پکوایا جائے کیونکہ وہ اپنے گلے کے معاملے میں بڑا محتاط تھا۔ اگر حاظرین ذرا بھی غیر سنجیدہ ہو کر بھنگڑا ڈالنے لگتے یا کوئی ٹکڑی آپس میں باتیں کرتی تو فقیر حسین فوراً اٹھ کر چلا جاتا.... اس کی کج ادائیوں، [illegible] حرکتوں پر لوگ اور بالا بالا کر کے اس کے پیچھے بھاگتے اور اس کی نازک مزاجی کو فخر سے آپس میں بیان کرتے۔ امیر لوگوں کا خیال تھا کہ اس بت کے پیچھے بھاگنے میں کوئی [illegible] نہ کمتری بلکہ الشان کے بارے میں یہ مشہور ہو جائے گا کہ وہ فن کے بے حد [illegible] اس کے دریچہ وہ یہ معنی ٹھہرے کہ انہیں قلبی طور پر روپے پیسے کی ہرگز پروا نہیں۔

[illegible] اپنے کاروبار کی ناکامی کے باعث کسی بھی فنکشن میں جانے سے گریز کرتا تھا۔ [illegible] جمیلہ کے ساتھ وہ بہت لیٹ شامیانے تلے پہنچا، سارا پنڈال رنگ برنگ بتیوں [illegible] وی آئی پی حضرات سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ گو اس کی ناکامیوں کی داستانیں پھیل [illegible] اقلیم دولت کے اس سردار کے لئے لوگوں نے راستہ چھوڑا اور وہ

دونوں عین سامنے والے صوفوں پر جا پہنچے۔ نجم رضوان نے پروگرام میں کچھ تبدیلی کر دی تھی۔ پہلے دور میں ہلکی پھلکی موسیقی اور کافیاں.... پھر رات کا کھانا اور اس کے بعد کلاسیکی موسیقی کی محفل برپا ہونی تھی۔

فقیر حسین کندھے پر پشمینے کی چادر بے پروائی سے لٹکائے تان پورے کے سروں سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ باقی سازندے بھی نظریں ملانے اور سروں کو تال میل میں لانے کی فکر میں تھے۔

معاً فقیر حسین کی نظر جمیلہ پر پڑ گئی۔ دبلا پتلا، لمبا، سانولا فقیر حسین اپنی نشست سے کسی راہب کے وقار کا مجسمہ سا اُٹھا۔ اس نے بڑے مودب انداز میں ہاتھ جوڑے، نظریں گرائیں اور بلند آواز میں کہا.... "اجازت ہے بی بی جی؟...."

جمیلہ نے سر پر دوپٹہ اُوڑھ کر ہاتھ جواباً جوڑے اور خوش ہو کر کہا: "جی اجازت ہے۔" کنسرٹ شروع ہو گیا.... شاہد نے آواز گرا کر جمیلہ سے پوچھا۔ "تم فقیر حسین کو جانتی ہو؟" جمیلہ نے کھسر پھسر میں کہا: "شاید اسے غلطی لگی ہے ورنہ اتنے بڑے فنکار کو جاننے کا میں تو دعویٰ نہیں کر سکتی۔"

پنڈال میں تجسس اور سکینڈل کی ہوا چلنے لگی۔ اب خوش فکرے دولت مند جمیلہ اور شاہد سے از سر نو بات کرنے کے شوق میں کھسکنے لگے۔ شاہد کی ناکامیاں اسے بارڈر لائن پر گھسیٹ لائی تھیں۔ وہ وقت دور نہیں تھا جب فیشن ایبل وی آئی پی طبقہ اسے مکمل طور پر نظر انداز کر دیتا۔ لیکن ایک "اجازت ہے" نے تجسس کی ایک نئی لہر پیدا کر دی۔ انٹرول تک لوگ مسٹر اینڈ مسز شاہد کے گرد گھیرا ڈال کر ان سے فقیر حسین دی گریٹ لیجنڈ کے بارے میں ذاتی معلومات اکٹھی کرنے کے لئے جمع ہو گئے۔ شاہد کے تیز دماغ نے بھی ایک خوبصورت کہانی گھڑ لی۔ وہ سب کو بتانے لگا: "پچھلے سال جب میں کروم ویل اسپتال میں جنرل چیک اپ کے لئے گیا تھا تو فقیر حسین بھی وہیں داخل تھے۔ ان دنوں فقیر حسین بڑے پریشان تھے.... گلے کے سرطان کی وجہ سے.... سارا سارا دن ہم بیٹھے تاش کھیلتے رہتے۔ انہیں میٹھی سپاریوں کا بہت شوق ہے۔ ڈاکٹروں کے منع کرنے کے باوجود یہ مجھ سے مانگ مانگ کر سپاریاں کھاتے تھے۔" اس کے بعد ایک جاندار قہقہہ اور نجم رضوان کے جنسی لطیفے.... یکایک شاہد کے ہاتھ میں "پرومیتھیوس کی آگ" آ گئی۔ وہ اخباروں کے رنگ

دار صفحوں سے حاصل کردہ انفرمیشن کو اپنے تخیل سے ملاقاتوں میں بدل رہا تھا۔ فقیر حسین اس وقت مائیکل جیکسن سے بھی زیادہ میڈیا کا پیارا تھا۔ اس کے انٹرویو، تصویریں، حالات زندگی قریباً سارے میڈیا پر چھائے ہوئے تھے۔ گولڈن ڈسک تو بن ہی چکی تھی، اب اس کی پلاٹینم ڈسک بننے کی تیاری تھی۔ گینیز بک آف انفرمیشن میں اس کا نام دنیا کے مشہور ترین سنگر کے طور پر چھپ چکا تھا۔ میڈونا اور مائیکل جیکسن اس کے ذاتی دوست تھے۔ فقیر حسین کو موسیقی کی دنیا میں "ماں سومک" کی طرح اعجوبہ روزگار سمجھا جاتا تھا۔

وہ مشاہیروں کا مشاہیر.... اور گائیکوں کا گائیک تھا۔

ہفتہ وار مذہبی درسوں نے جمیلہ کی زندگی کی تو سدھ نہ لی تھی، البتہ سوچنے اور باتیں کرنے کی قوت آ گئی تھی۔ اپنی موسیقی میں گم، سروں کی ادائیگی میں سرگرداں فقیر حسین کو جمیلہ کبھی سٹیج پر دیکھتی اور عش عش کرتی، کبھی اس کی آنکھیں شامیانے کی چھت پر جا ٹکتیں اور وہ سوچنے لگتی کہ واقعی وہ جسے چاہتا ہے عزت سے نوازتا ہے، جسے چاہتا ہے دولت سے مالا مال کرتا ہے۔ وہ نہ چاہے تو شہرت ملتی ہے نہ دولت.... اور جب وہ چاہے تو خود بخود سامان پیدا ہونے لگتے ہیں، خود ہی اسباب اکٹھے ہوتے ہیں۔ آپ ہی آپ توفیق مل جاتی ہے، مشقت نہیں کرنا پڑتی۔ سب کچھ از خود چالو ہو جاتا ہے۔

شامیانے تلے بزنس کمیونٹی اور شامیانے کے پیچھے خلاصی طبقہ، ڈرائیور، بیرے سارے فقیر حسین کے سحر میں آئے ہوئے تھے۔ انتھائی ہو کہ انترہ، بلمپت ہو کہ درت اس کا ہر سُر اللہ کے فضل کی طرح اس پر تنا تھا۔ کہیں کوئی نگاہ ایسی نہ تھی جو اسے ذاتی طور پر جاننے کی آرزومند نہ تھی۔ یہ توجہ، آرزومندی، خواہش ان امیر لوگوں کے پیسے سے ممکن نہ تھی....

جمیلہ بھی فقیر حسین سے ملنے کی خواہش مند تھی لیکن اس کی وجہ کچھ اور تھی.... شاہد اس رات اپنے ہم چشموں میں فقیر حسین کے ساتھ اپنی پرسنل ملاقاتوں کے بیان میں مشغول تھا۔ کروم ویل اسپتال کی اولین ملاقاتیں اور امریکہ کے قیام میں اس سحر ساز فنکار کے ساتھ گزارے ہوئے لمحے اس کی مبالغہ آمیز گفتگو کا نچوڑ تھے۔

جمیلہ نے پورے تیس سال بعد فقیر حسین کو دیکھا تھا۔ اس دوران جمیلہ نے اس کے متعلق مضمون پڑھے، اس کی تصویریں دیکھیں، اس کے ٹی وی کے پروگرام ڈسکس

گئے، کیسٹ سنے لیکن اس نے کبھی کسی کو نہ بتایا کہ وہ فقیر حسین کو قریب سے جانتی ہے.... اس وقت سے جب اس کے اباجی ریڈیو سٹیشن پر پروڈیوسر تھے اور بیس بائیس سال کا تپ دق زدہ فقیر حسین ان سے پروگرام مانگنے آیا کرتا تھا۔

ان دنوں جمیلہ کے اباجی کشمیری بابا کے مزار کے پچھواڑے ایک تنگ سی گلی میں رہتے تھے۔ گھر کی اوپر والی منزل میں لکڑی کے فریم ورک میں چلمنوں، کھڑکیوں سے ڈھکے شہ نشین تھے اور بڑے پھاٹک کے بغل میں چھوٹا سا دروازہ تھا جس سے آنے جانے والے، خاص کر فقیر حسین جیسے سر جھکا کر صحن میں داخل ہوتے تھے۔

ریڈیو پاکستان کے پروڈیوسر میر شبیر کاشمیری گھرانا حسن کی کان تھا اور جمیلہ ان خوبصورت لوگوں پر بھی مستزاد تھی۔ کشمیری چائے سی گالی گالی، نمکین نمکین، دراز قد، مغلیہ عمارتوں کی سی روشن، چنار کے درختوں کی طرح متناسب، اس کا انگ انگ سُر میں تھا۔ ڈل لیک میں چپو چلنے کی آواز اس کے گلے میں بیٹھی تھی۔ جب وہ گنگناتی، سب چپ ہو جاتے۔ بے جی باورچی خانے کی باسی تھی۔ گولاش، کھٹے بینگن، آب گوش بگھارتی وہ رک کر جمیلہ کا فلمی گانا سننے لگتی۔ دم بخود ہو کر بے جی سوچتی.... جمیلہ تو جادو کرنی ہے، کہیں جو اس کی آواز کسی کے کان پڑ گئی تو قیامت آ جائے گی۔

کشمیری لوگ سردیوں میں لمبا عرصہ بند کمروں میں گزارنے کے عادی رہتے ہیں۔ وہیں انہوں نے کشیدہ کاری، قالین بافی، اخروٹ کی لکڑی سے دل بہلایا۔ وہیں اپنی تنہائی کے پیتل کو صبر کے ریگ مال سے چمکانا سیکھا۔ بے جی میں بھی اپنے پرکھوں کا لہو تھا۔ وہ خوب جانتی تھی کہ خواہش کے چڑھے پانیوں کے آگے بند باندھنے سے پانی چڑھ آتے ہیں۔ تھوڑا بہت نکاس ہوتا رہے تو طوفان نہیں آتے۔ اسی لئے بے جی نے کبھی جمیلہ کو گانے سے نہ روکا۔

ایک دن جمیلہ کالج سے لوٹی تو بڑی ناخوش تھی۔ وہ باورچی خانے کے دروازے میں چوکھٹ ہی پر رک گئی۔ بے جی اس وقت گوشت کوٹنے کے عمل میں تھی۔

"کیا ہوا جمیلہ؟"

"کچھ بھی نہیں، بے جی۔"

"کچھ بھی .... روئی ہو؟" بے جی کو اپنی اولاد سے بات کرنا بڑا مشکل لگتا تھا۔ ان

لوگوں کی جذباتی اعانت کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔

"اوہ بھائی پھر بھی بتا تو روئی ہے تو؟"

"آپ لوگوں کو کیا! سارا دن ابا ریڈیو سٹیشن رہتے ہیں، شام کو دوستوں کے ساتھ شطرنج کھیلتے ہیں۔ آپ کو باورچی خانے نے قید کر رکھا ہے۔ میں کیا کروں؟"

"تمہیں کیا کرنا ہے جمیلہ؟"

"آج ہمارے کالج میں نعت خوانی کا مقابلہ تھا، میں سیکنڈ آئی۔" اس کی آواز تھرا گئی اور آنسو جھلا جھل آنکھوں میں اکٹھے ہونے لگے۔

"مبارک ہو، لو بھلا اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ تمہاری آواز ہی ایسی ہے، سیکنڈ تو آنا ہی تھا۔ اللہ کا شکر کرو جمیلہ...."

جمیلہ بپھر گئی.... "جی نہیں، میں شکر وکر نہیں کر سکتی۔ مجھے تو فرسٹ آنا تھا۔ جو لڑکی فرسٹ آئی ہے اس کی آواز تو خاک بھی نہیں، ہاں۔ ماسٹر اسے موسیقی سکھانے آتا ہے.... جج صاحب نے کہا کہ میری آواز کچی ہے.... اگر میں تھوڑی سی ٹیوشن لے لوں تو کمال کر سکتی ہوں۔"

بے جی کے مُنہ کو تالا لگ گیا۔

بھلا میر شبیر گانے کی ٹیوشن پر کیسے مانیں گے؟ ایسی روایتی محلے داری، پھر کشمیری بابا کے سامنے ٹبی کا علاقہ.... گھر میں کشمیری لوگوں کی روایات کا ایک پورا پنیرا، زندگی جینے کی ایک پوری اساس!

"بے جی! اباجی سے کہیں مجھے کسی اُستاد کی ٹیوشن لگوا دیں۔ ان کی پروڈیوسری کب کام آئے گی؟"

بے جی کو آگ لگ گئی.... "ہم تجھے کالج اس لئے نہیں بھیجتے کہ تو نت نئے مسائل لے کر آجایا کرے گھر.... میں نے سو بار میر صاحب سے کہا اسے نعت خوانی کی اجازت نہ دیں۔ چھوٹی اجازت سے بڑا حوصلہ کھلتا ہے۔ پر وہ تو تیرے آگے بولتے ہی نہیں...."

جمیلہ ہاتھ جوڑ کر کھڑی رہی۔

"اماں! بس تھوڑی دیر ٹیوشن لگوا دیں.... میں زاہدہ کو ایک بار ہرا دوں، پھر آپ بے شک خود ہی ٹیوشن بند کر دینا اپنی مرضی سے.... مجھے کچھ سُر تال کا تو پتہ چلے، لے تو

پکڑنی آئے....اماں! جب آپ کو اعتراض ہو، خود ہی ٹیوشن بند کر دینا۔۔جو میں بولوں تو آپ مجھے جوتے ماریں، شوق سے۔ پلیز بے جی، پرومس۔"

اس وقت جمیلہ کے دماغ میں ایک ہی بھڑ گھسی تھی اور وہ تھی زاہدہ کو نیچا دکھانے کی۔ جس طرح ٹرافی اٹھائے غرور سے مسکراتی وہ جمیلہ کے پاس سے گزری تھی، اس لمحے نے اسے پچھاڑ دیا تھا۔

جمیلہ مڈل کلاس لڑکی کی طرح پنجابی میں پلیز اور پرومس کہہ کر چپ ہو گئی لیکن اس کے اندر سے بذات خود ٹرافی اُٹھانے کا خواب کبھی چپ نہ ہوا.... میر شبیر کے گھرانے کو زیادہ اصرار کرنے کی عادت نہ تھی۔ وہ خواہشوں کو دبانے، احتجاج کو دم پخت کرنے اور واضح کو غیر واضح کرنے کے عادی تھے۔ انہوں نے اپنی ساری خوشیاں کھانے پکانے، ریندھے پرونے کے حوالے سے ترتیب دی تھیں جہاں آگ پر چڑھنا اور ڈھکنے لگا کر پکتے رہنا بنیادی عمل تھا۔ ویسے بھی دیکھا گیا ہے کہ عام طور پر جو قومیں مرد اور عورت کے اختلاط میں آزادی نہیں برتتیں اور اس رشتے کو جو باہمی قلبی لگن سے پیدا ہوتا ہے مقدس فریضہ سمجھ کر اس کی پاسداری کرتی ہیں، ایسی قوموں کی جنسی خواہش راستہ بدل کر معدے میں گھس جاتی ہے۔ پھر فرداً فرداً اور من حیث القوم عام طور پر وہ شدت اور جذبات جو وہ جنس مخالف کے لئے محسوس کرتے ہیں کھانے کھلانے میں ان سے خلاصی مل جاتی ہے اور یہی کھانا پینا ان لوگوں یا قوموں کے لئے شاستری بدھی سمان رسم و رواج کا ستون بن جاتا ہے۔ دسترخوان وسیع اور کھانے والے خوش خوراک ہو جاتے ہیں۔ یہ خوش خوراکی جسم بھدے اور سست الوجود کر کے افراد کو بڑے کاموں کے لئے نااہل کر دیتی ہے۔ مذاہب میں سب سے زیادہ پابندی جنسی اختلاط پر ہونے کی وجہ سے لوگ جھوما جھومی سے اجتناب کرتے، لیکن صنعتی انقلاب نے صورت حال بدل دی۔ جب دھندے ان گنت ہوئے اور کرنے والوں کی مانگ بڑھی، مرد اور عورت کو ساتھ کام کرنے اور وقت گزارنے کی مجبوری نے دل اچاٹ کر دیئے تو مذہب کی طنابیں بھی ڈھیلی پڑ گئیں۔ لبرل اور غیر مذہبی ہوئے بغیر صنعتی ترقی ممکن ہی نہ تھی۔ گھروں میں باہمی میل جول کم ہوتا گیا۔ فیکٹریوں، بسوں، سب ویز، ہوٹلوں میں ہر حلیہ خلق آپس میں خلط ملط ہونے لگی جنسی خواہش کا نکاس آسان ہو گیا۔ لیکن جو قومیں یا لوگ ابھی مذہب کے پابند تھے، انہوں نے

اس درد دیرینہ کو پیٹ میں چھپا لیا اور اس پیٹ پوجا کے سہارے مجلسی بھی ہو گئے اور جنسی خواہش سے قدرے آزاد بھی!

میر شبیر کے خاندان نے خواہشات کے نکاس کے لئے ایک بنیادی اُصول بنا لیا تھا۔ یہ لوگ بڑی خواہش میں سے تھوڑی سی ہوا نکالنے کے قائل تھے۔ خواہش کا راستہ نہ بدلتے، بس اسی خواہش کو تھوڑا بست بیچ بچاؤ کا راستہ دے کر اس کی شدت کم کر دیتے.... جس طرح ٹائر میں سے تھوڑی سی ہوا نکال دیں تو گاڑی اچھلتی، چھلانگیں لگاتی نہیں چلتی

"ابا جی . . پلیز میری ایک بات مان لیں.... پرومس، بس جس وقت آپ چاہیں گے بلکہ جب امی کی مرضی ہو وہ ٹیوشن بند کر دیں جی....پرومس.... پلیز۔" رات کو جمیلہ باپ کے پاؤں دبا کر اُٹھی تو ابھی تک زاہدہ ٹرافی اٹھائے اس کی نظروں کے سامنے تھی۔

"کیسی ٹیوشن؟" میر صاحب نے شطرنج کے مہرے اُٹھا کر پوچھا۔

جمیلہ نے نعت خوانی کا واقعہ پھر تفصیل سے بیان کیا اور آزردگی سے بتایا کہ کیسے زاہدہ ٹرافی اُٹھائے اس کی کرسی کو جان بوجھ کر ٹھڈا مار کر گزری تھی۔

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے.... یہ بھی درست ہے کہ میں ریڈیو سٹیشن پر پروڈیوسر ہوں اور ٹیوشن کے لئے ماسٹر ڈھونڈنا مشکل نہیں.... لیکن تم خود ہی خیال کرو . یہ دو قدم پر کس قسم کا بازار ہے....اور محلے والے کیسے جہلا ہیں!؟"

"ابا جی جب میں کالج گئی تھی تب بھی آپ یوں ہی کہتے تھے۔ بتائیے کوئی طعنہ، الاہنا آپ کے کان سے گزرا....پرومس، میں چھ مہینے میں اپنے سر تال ٹھیک کر لوں گی۔ مجھے "لے" پکڑنا آ جائے۔ مجھے پروفیشنل نہیں بننا ابا جی.... میں صرف نعت خوانی میں فرسٹ آنا چاہتی ہوں۔ صرف ایک بار.... پلیز.... ابا جی پرومس ... پلیز۔"

ابا میر شبیر بڑے لحاظ والے آدمی تھے۔ جمیلہ کے آگے جھکنے میں کچھ وقت لگا لیکن ناصبور بیٹی کے آگے آخر ہتھیار ڈالنے پڑے۔ ریڈیو سٹیشن پر اُستاد مراد خان سے بات کی۔ اُستاد صاحب بڈھے پھونس، آنکھ سے دکھے نہ پاؤں میں چلنے کی سکت۔ پروگرام مانگنے عموماً میر شبیر کے پاس آتے رہتے۔ پکا گانا ایک زمانے میں خوب گاتے تھے، اب نقلی دانتوں کی وجہ سے تان کے ساتھ سیٹیاں بھی بجتی تھیں۔ تان پورہ بھی لرزتا آواز بھی کانپتی، سم پکڑنے میں بھی چوک جاتے۔ میر صاحب کا خیال تھا کہ اُستاد مراد خاں خود ٹیوشن کے لئے

آئیں گے لیکن اُستاد صاحب نے اپنے آٹھ بچوں میں سے سب سے چھوٹے بیٹے فقیر حسین کو میر صاحب کے گھر بھیج دیا۔

یہ بھی زندگی کا عجیب چلن ہے کہ جب غلطی ہونا ہو تو کسی نہ کسی طور پر ہو کر رہتی ہے۔ ایک دروازہ تھوڑا سا کھلتا ہے اور انسان دھڑام سے غلطیوں کی غلام گردش میں داخل ہو جاتا ہے۔ فقیر حسین سردیوں کی شام میں جھٹپٹے کے وقت ایسے آیا کہ سر پر دوہرا کمبل تھا۔ بے جی بغیر چشمے کے آئیں، سمجھیں بڈھا اُستاد مراد خان ہے۔ دروازہ کھول کر رنگین شیشوں والی نچلی بیٹھک میں بٹھا دیا.... جمیلہ سے یہ بھول ہوئی کہ وہ سمجھی ابا جی نے فقیر حسین ہی کو بھیجا ہو گا اس لئے اس کا ذکر کسی سے کرنا بیکار ہے۔

فقیر حسین دوہرا کمبل سر پر اوڑھے بیٹھک میں داخل ہوا۔ تپ دق کا مریض، ایتھوپیا کا باشندہ، بے حد دبلا پتلا، قیدی سا خوفزدہ، بمشکل تمام بائیس برس کا ہو گا لمبے لمبے بالوں میں تیل لگنے کی وجہ سے لمبی ستواں ناک نے اس کے چہرے کا پروفائل اور بھی نمایاں کر دیا تھا۔ اس کے لئے میر شبیر کی بیٹھک کسی محل سے کم نہ تھی۔ . کین کے صوفے پر کپڑا چڑھا تھا، مینٹل پیس پر کالے کپڑے پر موتیوں سے کڑھی آیۃ بڑے جلال سے گھور رہی تھی۔ پیتل کے گلدان نقلی پھولوں سے لدے تھے۔ کمرے کی اکلوتی دری جابجا سے مسک گئی تھی۔ فقیر حسین کے گھر لکھنے کو بھی تھا بھی نہ تھا لیکن اس کے باپ نے فقیر کو آدھے پونے سر لگانے کی مشق نہ کرائی تھی اُستاد مراد خان سر کا ساگر تھا، اس نے آخری عمر میں اپنے بیٹے کو امیرالبحر بنا دیا تھا۔

"سلام علیکم سر...." جمیلہ نے اندر داخل ہو کر کہا۔

"وعلیکم سلام، بیٹھیے بی بی... "

جابجا مسکی ہوئی دری پر دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ . جمیلہ کہیں سے ایک پرانا ہارمونیم لے آئی۔ پھٹ پھٹ ہوا دے کر جب فقیر حسین نے سرگم نکالی تو جمیلہ اپنے سارے حسن کے باوجود حقیر سی ہو گئی۔ سرگم میں اتنی موسیقی بند ہے، اس بات کا اسے علم نہ تھا۔ دو چار پلٹے فقیر حسین نے لیے تو جمیلہ کو اپنے آپ پر ترس آنے لگا.... بھلا اس اعتماد کے ساتھ وہ گا سکتی ہے....؟ نعت خوانی کی ٹرافی کچھ لمحوں کے لئے دھندلا گئی۔

میر شبیر صاحب پروڈیوسر ریڈیو پاکستان کو جب فقیر حسین کا علم ہوا تو اسے ٹیوشن

دیتے ہوئے پانچواں ہفتہ تھا۔ اس عرصے میں جمیلہ بسنت بہار گانے لگی تھی۔

"تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟" میر صاحب بے جی پر گرجے۔

"لیں آپ ہی نے تو اسے بھیجا تھا۔ میں کیا بتاتی؟؟"

"مولی گاجر کے بھاؤ تک بتا دیتی ہو، یہ ذکر کرنا ہی بھول گئیں کہ جوان جہان فقیر حسین گھر آتا ہے اور وہ بھی تان پورہ اُٹھا کر! حد ہو گئی .. کیا سوچتے ہوں گے محلے والے؟.... بیٹی کو کیا بنانا ہے ہمیں؟"

"یہ تو اس وقت سوچنے کی بات تھی جب آپ نے اپنی لاڈلی کو ٹیوشن کی اجازت دی...."

اب مشکل یہ آن پڑی کہ فقیر حسین کا کردار، پابندی وقت، تعلیم دینے کا منفرد سلیقہ، کوئی ایسی سقم والی بات نہ تھی کہ اچانک بیٹھے بٹھائے اس پر کوئی الزام لگا کر نکالا جا سکے۔ یہ بھی زندگی کا عجیب چلن ہے کہ جب کوئی شخص شدت سے کسی آرزو میں مبتلا ہو جائے تو متعدد بار خواہش پوری ہونے کے اسباب خود بخود پیدا ہونے لگتے ہیں۔ جمیلہ کی خواہش بھی اسی شدت نے پوری کی۔

اس روز فقیر حسین شام کو دیر سے آیا۔ سردی کا موسم تھا۔ بارش کچھ دیر پہلے رکی تھی اور سرکتی سسکتی ٹھنڈی ہوا سارے گھر میں نقطہ انجماد کو بکھیرتی پھر رہی تھی۔ فقیر حسین کھیس اُوڑھے، تان پورہ اُٹھائے دری پر آکر بیٹھ گیا۔ جمیلہ نے ہارمونیم پر ہاتھ چلا کر اُوپر نظر کی تو فقیر حسین لرز لرز کر دانت کٹکٹانے کے عمل میں تھا۔ پھر وہ تان پورے سمیت کھیس تانے، بے ہوش، دری پر لڑھک گیا۔ جمیلہ نے اُٹھانے کی کوشش کی لیکن فقیر حسین بے سدھ تھا۔ ماتھے پر ہاتھ رکھا تو نہ جانے کتنا تیز بخار تھا کہ جمیلہ گھبرا کر اندر گئی اور بے جی کو ساتھ لے کر ترنت آئی۔ دونوں نے تھم تھمبو کر کے فقیر حسین کو کین کے صوفے پر لٹایا۔ سر کے نیچے تکیہ دیا اور اُوپر لحاف اُوڑھایا۔ فقیر حسین کی آنکھوں کی صرف سفیدی ہی نظر آ رہی تھی۔ وہ رضائی کی گرمی پا کر بے ہوشی سے گہری نیند میں چلا گیا، لیکن دونوں ماں بیٹی ششدر دری پر کھڑی رہ گئیں۔ خاصی دیر چپ رہنے کے بعد بے جی کے اندر کا اُبال مُنہ تک آ گیا۔ انہیں شبہ بھی نہ تھا کہ فقیر حسین جس کے لمبے بازو اور ٹانگیں صوفے میں سما نہ رہے تھے، کچھ سننے کا اہل ہے.... وہ بلک کر بولیں۔

"ملے جمیلہ، تیری ضد نے تو میری ناک کٹوا دی۔ اب جو میر صاحب ریڈیو سٹیشن سے آگئے تو میری تو شامت آجائے گی۔ مجھے تو اس کے گھر کا بھی پتہ نہیں ورنہ ٹیکسی پر ہی چھوڑ آتی!"

"کیوں، شامت کیوں آئے گی بے جی؟" جمیلہ نے ان بھول پوچھ لیا۔

"ایک اجنبی نامحرم.. اور ہم دونوں اکیلی ہیں.... اس حال میں۔"

جمیلہ نئی تعلیم سے آراستہ تھی اور بے جی جتنی ڈرپوک بھی نہ تھی۔

"بے جی! اُستاد جی کو تیز بخار ہے۔ ابھی ہوش میں آگئے تو گھر چلے جائیں گے۔ اس قدر آنکھیں پھاڑنے کی بھی ضرورت نہیں۔"

بے جی طیش میں آگئیں "چلے جائیں گے.. آگئے تھے.. یہ تو کیسے بول رہی ہے جمیلہ.... معمولی میراثیوں کا لڑکا اور تو اس کی اتنی عزت کر رہی ہے، کیوں؟... تیرے ابا جی سن لیں تو میری چمڑی اُدھیڑ دیں گے۔"

نہ جانے کیوں جمیلہ کی آواز اونچی ہو گئی۔ "بے جی! یہ میرے اُستاد ہیں۔ گُرو ہیں میرے.... میں ان کی عزت نہ کروں؟ پھر ان کا علم مجھ سے کہیں زیادہ ہے"

اب ماں بیٹی جھگڑے کی حدود میں داخل ہو گئیں اور انہیں بھول گیا کہ فقیر حسین کہیں سنتا ہی ہو۔

"میں پچھلے دنوں سے یہ دیکھ رہی ہوں جیلہ! تیرے تیور بدل گئے ہیں۔ جو بات بیٹی کے دل میں ہوتی ہے، ماں کے ناخنوں میں ہوتی ہے۔ مجھے کوئی ایسی ان پڑھ جاہل نہ سمجھنا۔ جو کچھ سات پردوں میں چھپ کر تو سوچتی ہے، مجھے سب معلوم ہوتا ہے۔" ماں گرجی۔

"ولیں، میں نے کیا سوچا ہے بھی.... کیا کیا ہے میں نے کہ آپ بپھر رہی ہیں؟" جمیلہ معترض ہوئی۔

ماں غصے میں چند ثانیے چپ رہی، پھر گردن اکڑا کر بولی: "ضروری ہے کہ کچھ کرے تو پتہ چلے۔ تیرا رویہ ہی ایسا ہے جیسے مری جا رہی ہے.... اب اُستاد جی کے لئے کشمیری چائے بن رہی ہے، اب مٹھائی جا رہی ہے، اب گلاس مانجھا جا رہا ہے، اُستاد جی کا گلا نہ خراب ہو جائے۔ بھئی خدا کو کسی نے دیکھا نہیں، مانتے سبھی ہیں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں بے جی!" جمیلہ کے سر سے چھت اُڑ گئی۔

"ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ ابھی تو میر صاحب نے تجھے فقیر حسین کو دری پر سے اُٹھاتے نہیں دیکھ لیا۔ وہ دیکھ لیتے تو قیامت آجاتی.... فلمی ٹھاٹ لگتا تھا۔"

پتہ نہیں کیا بات تھی لیکن جمیلہ بھی کبھی کبھی لمبے سفر لمحوں میں طے کر لیتی۔

"زیادہ سے زیادہ کیا ہو گا بے جی! زیادہ سے زیادہ میں اُستاد جی سے شادی کر لوں گی ناں.... ایسا فنکار صدیوں میں پیدا ہوتا ہے، بڑا اعزاز ہو گا میرے لئے...."

زناٹے سے ایک تھپڑ جمیلہ کے منہ پر آیا۔ فقیر حسین یکبارگی صوفے سے ہاتھ باندھ کر اُٹھا۔ "آپ انہیں کچھ نہ کہیں بے جی.... میں چلتا ہوں۔"

بے جی کا شاور بند ہونے میں نہ آرہا تھا۔

"جمیلہ ہم نے تیری خواہش کا احترام کیا.... سارے اُصول توڑ کر.... ہم نے تجھے یہ آزادی نہیں دی تھی کہ اس بے عزت کنگلے کو ہمارے منہ کی کالک بنا دے...."

"آپ ہی تو کہا کرتی ہیں عزت اور دولت خدا دیتا ہے.... وہ کسی کی سفارش سے تھوڑی دیتا ہے، ان کو بھی دے گا بے جی...."

"آج تک تو نے کبھی میرے سامنے منہ نہیں کھولا جمیلہ اور آج اس بھک منگے مراثی کی خاطر میرے منہ آ رہی ہے۔ لعنت ہو تجھ پر...."

فقیر حسین اور جمیلہ دونوں چپ ہو گئے۔ پھر فقیر حسین نے رضائی کو پرے ہٹایا، تان پورہ اُٹھایا اور لڑکھڑاتے قدم باہر کی جانب اُٹھاتا ہوا بولا: "بے جی رضائی دھلوا لیجئے گا"

"ٹھہرو.... ٹیوشن کا حساب کر کے جاؤ.."

"ریڈیو سٹیشن پر لے لیں گے جی۔ اچھا جی خدا حافظ۔"

فقیر حسین کانپتا لرزتا پسینے میں بھیگا، کھیس میں تنبو سا بنا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

جمیلہ کو فقیر حسین سے محبت نہ تھی۔ وہ اس کے ساتھ ساری زندگی تو کیا ایک دن گزارنے کا خواب بھی نہ دیکھ سکتی تھی۔

جمیلہ خوابوں والی لڑکی بھی نہ تھی۔ لیکن اس وقت فقیر حسین کی بے چارگی نے

اس کے دل پر بڑا گہرا زخم چھوڑا۔ اس نے اپنے ہوش میں کبھی بے جی سے ایک سخت جملہ بھی نہ سنا تھا۔ اب نوبت جھڑپ تک آ گئی۔ اس کا جی جان سے جمیلہ کو ملال تھا۔ اس رات وہ دیر تک جائے نماز پر بیٹھ کر روتی رہی۔ اسے فقیر حسین کو حاصل کرنے کا شوق تھا نہ وہ بے جی پر اپنی معصومیت ثابت کرنا چاہتی تھی۔ بس رہ رہ کر اس کے دل سے ایک ہی صدا نکل رہی تھی: "یا میرے مولا! جیسی بے عزتی سے تو نے اُستاد جی کو نکالا، ایسے ہی بڑی عزت سے انہیں یہاں لانا... عزت اور رزق تو ہی دیتا ہے میرے مولا..... مجھے یہ دن دکھانا ضرور.... میرے آقا! میرے گھر والوں، دنیا والوں کو یہ ضرور جتانا کہ عزت اور رزق تو ہی دیتا ہے، اس پر کسی کا اجارہ نہیں۔"

شاید یہ گھڑی قبولیت کی تھی... شاید اس کے آنسوؤں نے ساتویں آسمان میں بلڈوزر کر کے بڑا سوراخ کر دیا تھا... ہو سکتا ہے اسی لمحے جمیلہ کی معصومیت نے اُوپر والوں سے پرومسری نوٹ لکھوا لیا جس کی عندالطلب تاریخ کا خانہ خالی تھا۔

فارن سوٹوں میں ملبوس، ناگ پھن ٹائیاں لہراتے، آرام دہ اطالوی جوتوں میں ڈٹے، تمباکو اور خوشبوؤں میں بسے بزنس ٹائی کون، سٹاک ایکسچینج کا منہ موڑنے والے، بیرون ملک فائیو سٹار ہوٹلوں میں چھٹیاں گزارنے والے، بچوں کے سکول، تازہ سکینڈلز اور غیر ملکی سیاحتوں کو گفتگو کا حصہ بناتی ہوئی خوش باش گرومڈ عورتیں.... کھانے کی چیزوں کے اردگرد براؤن، برونز اور گولڈ کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ اس حیثیت پرست، خودپسند اور خود آگاہ دولت مندوں کی نگری میں پشمینے کی چادر کو اپنے نحیف کندھوں کے گرد لپیٹتا ایک جادوگر آ گیا تھا۔

اس کے پاس شہرت کی بانسری تھی.... وہ اپنے فن میں یکتا تھا اور اس کی اکیتائی کو دولت کی باڑھ توڑ نہ سکتی تھی۔ فقیر حسین نے دھڑی دھڑی کر کے سارے شہر کو لوٹ لیا۔ مرد حضرات پھر بھی کچھ دھانسے لیکن عورتیں تو اس دھڑی کے گرد گوپی رنگ اکٹھی ہو گئیں۔ نیوز رپورٹر کی طرح ہر عورت اپنے لئے ایک الگ کہانی خارج داخل کرنے کی فکر میں تھی۔ کچھ بے پر کی افواہیں، کچھ رسالوں سے اخذ کی ہوئی خبریں، انٹرویوز، فضا میں پھیلے تھے.... جمیلہ ان پری وش خواتین میں راہ بناتی فقیر حسین تک پہنچی:

اس کے آنے پر فقیر حسین نے نگاہیں نیچی کر لیں اور ہاتھ پرارتھنا کے انداز میں جوڑ لیے۔

"بی بی کیسی ہیں آپ؟"

کچھ ابرو تحیر، کچھ تجسس میں اُٹھ گئے.... آرٹ سے محبت کرنے والی خواتین کے لئے یہ ایک نیا سکینڈل تھا۔

"اچھی ہیں آپ؟...."

"جی..."

"اور بے جی....؟"

جب سے میر شبیر حسین فوت ہوئے، بے جی فالج سے پڑی تھیں۔ جمیلہ کو میکے گھر جانے کی فرصت کم کم ملی۔ بے جی کے لئے ایک بڑھیا نوکرانی رکھ دی تھی جس کی تنخواہ اور اخراجات جمیلہ باقاعدگی سے ادا کرتی... لیکن اس کی زندگی کا ڈھچر ہی کچھ ایسا تھا کہ کشمیری بابا کے محلے کی طرف جانے کا اتفاق کم ہوتا۔ جمیلہ بے جی کا نام سن کر گم صم ہو گئی۔

"اور بے جی؟"

"وہ بھی ٹھیک ہیں جی... آپ کو یاد کرتی ہیں۔" پتہ نہیں جمیلہ کے منہ سے کیوں نکلا؟

"میں حاضری دینے آؤں گا جی... آپ کی طرف۔ اور میر صاحب؟"

"اباجی تو.... فوت ہو گئے..."

دونوں نے تھوڑی دیر خاموشی سے سر جھکا لیا... جیسے کسی بڑے آدمی کا ریفرنس ہو

سنا ہے شہرت اور دولت میں ایک صفت میلہ گھومنی کی بھی ہے۔ یہ پھوار کی طرح پڑتی ہیں، شبنم کی طرح اُڑ جاتی ہیں اور چھوا چھپ غائب ہو جاتی ہیں۔ جب ستارہ پیشانی فقیر حسین نے سارے لوگوں کے سامنے جمیلہ کے آگے عاجزی دکھائی تو پتہ نہیں کیسے شہرت اور دولت کی روٹھی ہوئی آبشار کے چھینٹے شاہد پر بھی آ پڑے۔ اس بھولے بسرے جوڑے کا گلیمر ایک بار پھر زندہ ہو گیا۔ کچھ نے سکینڈل کی زبان میں کھسر پھسر کی۔ کچھ نے دست بدست تجسس کی تھالی پھرائی۔ کچھ نے آپس میں سوچا کہ شاہد کو از سرنو

راستہ دکھانے کی ضرورت ہے.... سنا ہے دینے والا بڑی حکمت سے دیتا ہے۔ جونہی شاہد کا مردہ ذکر زندہ ہوا، اس کے دن پھرنے لگے.... بدنصیبی کے ہاتھی کو کنکر لگتے ہی موت آ گئی۔ شاہد کا حسن بصیرت، سکیمیں، حسن انتظام، تدبیر سب کو نخلخہ سونگھایا گیا.... ہولے ہولے شاہد اپنی تجویزوں کا قائل، اپنی ذات پر بھروسہ کئے پہلے سے زیادہ خوش فہمی اور تکبر سے شہر کے وی آئی پی طبقے میں شامل ہو گیا۔ اسے لمحے بھر کو بھی گمان نہ گزرا کہ شاید اس میں مشیت کا بھی کوئی ہاتھ ہے.. اور رضائے الٰہی بڑی ادا اور حکمت سے اسباب پیدا کر دیتی ہے۔

لیکن یہ اور بات ہے کہ جس روز فقیر حسین بے جی کے پاس پہنچا، ان کا جنازہ گلی سے نکل رہا تھا۔ جمیلہ کو ایک ہی رنج تھا کہ بے جی نے فقیر حسین کی شان و شوکت کیوں نہ دیکھی۔ پتہ نہیں چھوٹے فرشتوں نے معاملہ غلط کیا کہ دعا کا پروسری نوٹ بے وقت تھا .. پتہ نہیں وہ کیا مصلحت تھی جس کے تحت بے جی کو اپنے کئے کی سزا نہ ملی.. تکبر میں سنا ہوا، شیخیوں کی آتش بازیاں چھوڑتا شاہد پھر اپنی دولت اور شہرت پر بحال ہو گیا۔

یہاں تک تو وہ سمجھ پائی تھی کہ عزت اور شہرت اللہ کے اذن سے ملتی ہے لیکن یہ بات ابھی اس کے دماغ میں نہ آئی تھی کہ کبھی کبھی بے قصور کو سزا ہو جاتی ہے اور کبھی بھاری غلطیاں کرنے والے ہری سنگھ نلوہ جیسے اول بچ جاتے ہیں شاید وہ روز حساب کے فلسفے پر پورا ایمان نہ رکھتی تھی اور اس کی اہمیت نہ جانتی تھی، ورنہ وہ شاہد اور بے جی دونوں کو معاف کر دیتی!

اسی لئے تو کبھی کبھی جب اسے ہجرت زدہ بچے بہت یاد آتے، اپنی بے مقصدیت اور بے معنویت سمجھ نہ آتی تو سنگ مرمر کے فرش پر جابجا اس کے آنسو چھینٹے بن کر گرتے جنہیں دیکھ کر شاہد کو غصہ آ جاتا اور وہ اونچی آواز میں تکبر سے کہتا.. "پتہ نہیں یہ گھر کب منظم ہو گا۔ پانی کے چھینٹوں سے فرش کی خوبصورتی تباہ ہو جاتی ہے۔ تم نے مجھ سے کچھ نہ سیکھا جمیلہ.... نہ پلاننگ، نہ وقت کا استعمال، نہ بندوبست، نہ تجویز.... مجھ سے سیکھو جمیلہ.... مجھے مانو.."

28

منسراج کا بین

سرت میں لاویں تو دسے سال بڑا مینہ برسے رہا۔ سکل وخت بارش "ترم تو ترم تو" اترے۔ شام سے گھنا اندھیرا ہو جاوے۔ اودے کالے بادل بھیتر باہر ایک کر دیں۔ پھر رات بھر بارش دیمہ ڈرائے دھمکائے۔ رپی رات بھر بولے۔ بارش کنی بوند نہ گرے۔ سمندر اتر آوے لہراں سمیت۔

وسیان میں لاویں تو اسی سال میں بہو زنت رانڈ ہوئے رہی۔ سارے پھل پھول پتر جھڑ گئے۔ اندر سے پھلی چھمک نکل آئی۔ اسے دیکھ تو بیٹے کا گم بھی من سے بھاگا پھرے۔ زنت پٹی پر ماتھا پھوڑ پھوڑ لہولہان روتی رہے۔ پھر چادر تان لیٹ جاوے۔ چاروں بچے رینگ رینگ کر کبھی ادھر سے چادر کھینچیں کبھی اُدھر سے، پر وہ موہ کی تاپ میں جلتی لراتی اپنے گھور اندھیرے میں بھٹکتی رہوے۔ جو میں اس کے دُکھ کو ہلکا کہوں تو رب سے ڈر سلے، جو بھاری کہوں تو جھوٹ لگے .. ہمارا اکیلا جاہد جب گھر سے چارپائی پر نکلا تو پوری دھرتی پیروں سے نکال لے گیا آسمان سمیت۔

سوچوں تو اسی سال میرے بیرن کے جڑواں بچے ہوئے۔ ایک بچہ بھائی پاس رہا پر مر گیا جو میری ماں نے اپنی گود ڈالا کبھی ایک تاپ بھی اسے نہ چڑھا۔ میرے بھائی کی گھر والی بڑی ہو کر بانجھ رہی۔ دوسرا بچہ اس کا ہو کر نہ پلا.... ہاں جی.. سچ ہووے

پانی بھرن پنہاریاں رنگا رنگ گھڑے
بھریا اس کا جانئے جس کا توڑ چڑھے

ایسے بھیگے دن.. سورج بادل کا کھیل۔ جیون ابھی کھانڈے کی دھار نہ بنا ہووے۔

ل منسراج (من - سراج) جماتلیہ کا پالتو ہرن

بڈھے بسیرے کی پنشن سے روکھی سوکھی چلا کرے۔ ایک دن مسجد سے واپسی پر سسرے نے چوکھٹ میں کھڑے چادر تانی بہو کنے دیکھا۔ اپنا جوان بیٹا اچانک جمین میں گڑ گیا پر اس کو بہو کی چوٹ جیادہ لگی۔ نہر کنارے اُونچے پلازے کی تیسری منزل پر کانڈی بٹھل اُٹھائے جاہد کا پاؤں رپٹا پاڑ سے گرا۔ تین پہر ہسپتال میں بے ہوش پڑا رہا پھر مٹی ہو گئی۔ اب متھا پھوڑنی بہو نہ بولے نہ چالے بس چادر تانے الانی منجی پر مردہ پڑی رہے.... آتے جاتے بسیرے کو یہی درشن۔

ایک دن بڈھے بسیرے نے کھنکار کر چادر اُتاری مجھے للکاری آواج دی ..."دیکھ ری جوبیدہ اسے تو وندل پڑی ہے۔ کہیں سے ڈھونڈ ڈھانڈ پرانا کھونسڑا لا کر سونگھا بہو ہوش میں آوے... اپنے"

بڈھے سسرے نے گھٹنے پر سر رکھا۔ پوری بتیسی تالے بند۔ میں جوتا سونگھایا۔ پل بھر گزرا آنکھ کھولی۔ بسیرے نے کٹوری میں عرق گلاب ڈال کر پلایا۔ میں پاؤں کی تلیاں جھسیں، ہاتھ بازو ملے۔ زنت بدھی میں آئی۔ بیٹھی ماں کو دیکھ کر بچے رینگتے کھسکتے آ گئے۔ کوئی گود کوئی کندھے چڑھا۔ سسرے کو پاس جان کر کپڑوں کی سرت آئی۔ سر کی چدر ٹھیک کی۔ نجریں گالوں سے جوڑلیں۔ سوگ کی ماری بندہ گڑیا نجر آنے لگی۔

اب بسیرے نے مت دینا شروع کیا... "دیکھ جاہد کی بی بی! تجھ کو تیرے سنجوگ کا پھل مل گیا۔ تیرے آگے چار کھیلتے ہیں۔ اُدھر ہم دونوں کنے دیکھ... ایک ہی بیٹا نہ آگے نہ پیچھے۔ ساری عمر کی کمائی اپنے ہاتھوں جمین میں دبا دی.... اس کی اچھیا اس کے کلم۔ کوئی پوچھے بسیرے ڈپٹی کمشنر کے دفتر سنگ پنسن پائی؟... ہاں جی پائی! تو میو جاتی کا ان پڑھ، اِدھر آ کر تعیم ہاتھ آئی؟ ... ہاں جی آئی! ساری عمر کاں صندوقڑی اُٹھائے کر صاحب کے سنگ سنگ کوٹھی گیا۔ پہرہ رہے چوبیں گھنٹے۔ کبھی نہ بھٹکے اُدھر کوٹھی کے سامنے۔ پر اِدھر کے سپاہی لوگ بسیرے کو دیکھ دروجہ کھول دیتے رہیں.... کوئی پوچھے اجت پائی بسیرے؟ ہاں جی بہت پائی! .... پر کس بھاؤ زنت بی بی.... چاروں کھونٹ نجر چلا.... کیا ملا تیرے سسرے کو. اپنے ہاتھ دروجہ کھول کر قبرستان لے گیا سارا مال.... کھد ڈالا جمین تلے .. اور تجھے کیا پتہ زنت بی بی... کیا ہوا میرے ساتھ۔ چپ کر جا۔ نہ رو۔ تیرے آگے تو چار کھیلیں ہیں"

اب بسیرے کے بھی آنسو بہے۔ مکھ پر لمبی لمبی جھریاں، سوکھے ہاتھ پیر، گیروا گہرا

سانولا رنگ، سفید بھنویں، ٹوٹے گرے دانت، آنسو گرے تو مکھ اور ٹوٹ پھوٹ جاوے۔ میری رانڈ بہو نے ترنت کھدر کی چدر میں موتی سمیٹے اور اپنی آنکھوں کو لگا لئے۔ اکھڑ راجپوت بولے گیا.. "زنت بی بی ہم میو لوگ.... کرنال بستی سے اُٹھ کر ایدھر آئے۔ سیخوپورہ کی دھرتی کو دیسہ سے لگایا.... ہم میو وکاں کا کیا کام پڑھنے لکھنے سے، پر نئی دھرتی کی ریت دیکھ کر پڑھے.... سکول گئے، ماشٹروں کی مار کھائی۔ آٹھ جماعتاں پاس کی۔ ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں چپراسی لگے رہے۔ ددرے پر صاحب جاوے تو بسیرا ساتھ.... کوٹھی سدھارے تو بسیرا ساتھ۔ پر تیرے گھر والا سکول چھوڑ بھاگ گیا.... میں دل میں کھوب جانا یہ میو جاتی کا پرکھ ہووے، مانے پر مانے ناں... چھوڑ دیا... بس محنت مزدوری کو جا لگا۔ کیا دیا گارے چونے کے بٹھل نے؟ پاڑ سے گرا.... اِدھر آ گیا دفن ہونے کو ہمارے پاس ... لے میں کوئی روتا ہوں .. اکیلا تھا میرا جاہد۔ کوئی نیر بہا میری آنکھوں سے؟ کوئی جبرجستی کی میں نے اپنے مالک سنگ؟"

مینہ کے تیز تیز چھینٹے بسیرے کے نینوں سے گرے۔ میری رانڈ بہو نے اپنے سالو سے ترنت اس کی آنکھیں پونچھیں۔ اُٹھ کر پانی کا گلاس لائی۔ سسرے کے مُنہ سے چھوایا۔ بڈھے سے پیا نہ جائے۔ بہو کبھی ہاتھ جوڑے کبھی پاؤں پکڑے۔ آخر کو دونوں اِک دوجے کو چپ کرا کر پرانیاں باتاں کرنے چل پڑے۔ وہ کھاٹ پر بچہ گود میں لے کر بیٹھا۔ زنت چوکی گھسیٹ بیٹھ کر پیر دبانے لگی

یوں ہی جب جاہد کو میں سمجھا بجھا سکول بھیجا کروں ناں تب جاہد جانا نہ چاہے۔ سکول میں بولے اوکھے اوکھے سوال دیا کرے ماشٹر .. میں کہوں "تو نکال تو سہی، دیکھ تیرا ابا آٹھوں کر گیا ناں۔" پر جاہد تو سلیٹ پر پھر لکھے پھر مٹاوے... لکھے پر پھر مٹاوے۔ میں پوچھوں "کیا ہوا رے، کیوں لکھ لکھ کر مٹائے جات، کچھ جم کر کام کر!"... جاہد اکھاں بھر کر بولے "میا طریقہ تو ٹھیک ہووے پر جباب ٹھیک نہ آوے۔ سوچوں رقم ہی گلط لکھی رہی نا تب۔"

ایسے ہی میرے من میں رات گئے گلط جباب آویں۔ سوچوں، دھیان میں لاؤں۔ کئی رقمیں جوڑوں۔ اے پالن ہار! ساری عمر بسیرے سنگ کٹ گئی پر اب کیسے جباب گلط نکلا؟ سوچوں تو کوئی رقم ہی گلط لکھی گئی۔ طریقہ تو میرا بھی ٹھیک ہووے۔ اب میرے

مٹائے تو گلط رقم مٹے ناں۔ وہی جب چاہے تو مٹاوے۔ آدمی کے اپنے کنے تو کوئی اپائے ناں۔ وہی رب سچا جو بیدہ کی رقم مٹائے تو مٹے۔

لو پر سوچ کا بھی کچھ ٹھیک ناں۔ اِدھر سوچوں اُدھر بھول جاؤں۔ جو بھول جاؤں تو پھر سوچوں۔ عمر تالی عورت کو ہر گھڑی سوچ بچار۔ سب موسم ملے بیٹھے۔ ہر گھڑی نویں بھی پرانی بھی

سائیں سے سب ہوت ہے بندے سے کچھ ناہیں
رائی سے پربت کرے، پربت رائی ماہیں۔۔!

روتی کرلاتی تاؤ کنے جب میں پہنچی تو اس کی سمجھ میں کچھ آوے کچھ ناں آوے۔ میں بھی کیا بتاواں؟ بتانے کو کچھ ہووے تو مُنہ کھولاں۔ مُنہ کھولاں تو آنکھوں کی ندی چڑھ آوے۔ نیر نیر ندی نالا ملے تو دریا بنے۔ ندی ندی جڑتی جائے تو گھم گھیر دریا ہو.... دریاؤں کے جل مل جل کر سمندر بنادیں۔ اب آنسو آنسو کی کتھا تاؤ کو کیا بتاویں؟ اتنا بڑا گم کا پوکھر کیسے بنا جس ماں ڈوب جانے کو من چاہے... اس کی کتھا تاؤ کو کیسے بتلاویں؟.... نیر تو دب بہیں، بے کار بہیں۔

بس تاؤ جمیل سمجھائے رہا۔ "دیکھ تاؤلی! سارا تو تیرا سر سفید ہوا۔ مُنہ میں دانت کہیں ہووے رہا کہیں ناں۔ آواج تیری سننے کو اپنے کان کو ہتھیلی کی پیالی بنا کر لوگ سنیں۔ کھوہ میں گری کنکری کا پتہ لیویں۔ پھر ایسا کٹھور دل بھلی مانس تجھ سے تو بسیرا بھلا۔ بہو بچوں کے سر پر ہاتھ دھرے سے جائے.... اپنی پیڑ بھول... پرایا گم بہو کا سہے۔ کٹھور جالم یہ عمر کوئی اپنے لئے جینے کی ہووے؟ ایسا پتھر کر دیا تجھ کو جاہد کی موت نے۔ کسی دوجے کا دُکھ تیں کو نجر نہ آوے پل بھر کو۔ اتنے برس جب تیں لاہور گجار لئے تب اب کاہے منراج کی لاٹ تلے آبیٹھی.... اُدرے پالن ہار کچھ اثر نہ گھیرے اس بڑھیا کے من ماں.... تو ہی کچھ سمجھا اس کٹھور کنے۔"

اب تاؤ کے سامنے کیا سینہ پیٹوں۔ کیسے بتاواں تاؤ کو سارا راج پاٹھ چھن گیا؟ ٹوٹی کھاٹ، نہ بان نہ بسترا۔ کوئی دن کو ٹھہر جا تاؤ چولہے کا بالن بن جاؤں، کیا بتاواں تاؤ کنے؟ چولھے چونکے پر زنت بی بی کا قبجہ ہوا۔ بڈھے بسیرے کو نہ میرے مرنے کی پھکر نہ جینے کی۔ آگے جب میں چولھے آگے سے گھٹنا پکڑ کر اُٹھوں تو بسیرا اپنا ناڑیوں بھرا سوکھا ہاتھ

بڑھاوے۔ اپنا جور لگا کر کھڑا کر دے۔ اب پیٹھ موڑ زنت کے بچوں کو آواجاں مارن لگ جاوے۔ تاؤ تیرے سنگ کیا بتاواں۔ کدھر سے سروع کراں۔ اور جو بتاواں تو تاؤ سمجھے کیا؟ میرے اماں باوا تو پاکستان ہی نہ پہنچ لئے۔ راہ میں ہی گل کٹیئن نے ڈھیر کر دیئے۔ ماں کی کھون بھری چدر سر پر اُوڑھے میں باڈر پہنچی ... ساری عمر لہور میں گجر گئی بسیرے سنگ۔ اب سر پر چدر ہی نہ رہی۔ تاؤ کو کیا بتاواں کیوں آئی رہی میں من سراج کی لاٹ تلے۔ میرا تو سارا مال ہی جمین نے کھالیا۔ اب تو پالن ہار کو آواج نہ دے سکوں، تاؤ کی رہی دوسری بات.... وہ تو ہو یا بسیرا ساتھ... بڑھاوا دیوے تو بسیرے کوں.... میری بات کب سمجھے؟ میرا تو سارا مال ہی لاہور کی جمین نے کھالیا۔ میں کوئی خوشی سے تو نہ آ رہی من سراج کی لاٹ تلے!

کیسے بتاواں یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ چھوٹی باتاں سے بڑی باتاں جنم لیں۔ زنت کا سب سے چھوٹا گلزار رو رو ہلکان، منی کے دانت نکلتے ہوئیں، وہ جدا اُوکھی۔ بڑے کاکے کے آنکھ دکھنے آئی رہی۔ چاروں میں میں کر کے روئیں تو لگے گھر کا تختہ اُلٹ گیا۔ چاروں کو گھیر لہار، بیٹی کالالچ دے دالہ میں گلی میں نکلی۔ ایک ڈھاک پر، ایک اُنگلی لگی، دو روں روں کرتے ساتھ چلے۔ بھکانے والا سائیکل پر ہووے۔ اس کے کنے پلاسٹک کی غلیلیں، چھوٹی چھوٹی قینچیاں، بھکانے، پلاسٹک کی پستولیں، پٹاکے، بچوں کو پچکارنے لئے انت کا سامان ہوا کرے۔ وہ تو فرسے آگے نکل گیا۔ میں واجاں مارتی رہ گئی۔ میرے گھٹنے سے شتابی چلا نہ جائے۔ روتے بچوں کا ساتھ۔ کھسکاتی کھسکاتی، دوڑتی رکتی سائیکل والے کے مگرے مگرے گئی۔ پر وہ تو سائیکل پر ہووے۔ گلی کی نکڑ پر جائے کے دیکھاں تو وہ رن داتا شتاوا موڑ کاٹ اُونچے اُونچے آواز لگاتا پکی سڑک پر ہو لیا۔ بچے تو گلا پھاڑ پھاڑ کر رونے لگے۔ بڑے نے تو ابا ابا کہہ کر بلکنا سروع کر دیا۔ میں کو چپ کرانا مسکل۔ جھوٹے وعدے، اگلیاں پچھلیاں باتاں میں لگا گھر مڑی۔ گلی سے تین سیڑھیاں اُونچا ہمارا دو کمروں کا گھر ہوا کرے۔ ہرا دروبا ادھ کھلا چھوڑ گئی۔ وہ ٹوٹے دانت سمان پڑا جھانکے۔ آنگن میں پاؤں دھرا تو بسیرا کی آواج آئی۔ وہ آلااودل گائے رہا۔ جوانی میں بسیرے کی آواج سن کر من میں خواب جاگیں۔

لو پھر یہ بات بھی بتانے رہوں۔ بسیرے کے کھاندان سنگ میرے تاؤ کا کوئی

سمبندھ ناں۔ تاؤ ہمارا لڑکوں کی کھوج میں پھرے۔ پھر کسی نے ٹوہ دی۔ لڑکا جوان گیروے سانولے رنگ کا، آٹھوں پڑھا لکھا لاہور کے ڈپٹی کمشنر کا چپراسی لگا ہووے۔ تاؤ کی اپنی تین ٹانڈے جیسی دھیاں، اُوپر سے میں چوتھی مالک نے لادی۔ تو میرا پالن ہار کے کاموں پر زبھر۔ نہ کبھی رویا نہ گلہ سکایت کی۔ بسیرے کو بلایا سنجوپورے ماں۔ تاؤ کا کھاندان اس سمے منسراج کی لاٹ کے پچھواڑے کچی پکی بستی کی سکل میں رہت بنائی رہے۔

بسیرا آیا۔

یہ لمبا قد، سر پر راجپوتی صافہ، لمبے باہو والی گھیرواں قمیص، کانوں میں گول گول سنہری بالیاں، کلائی پر گھڑی۔ چلے تو مور تھرکے، بیٹھے تو راجہ لگے۔ تاؤ بولا.... "لے جوبیدہ بارش آئی کھڑی، بھادوں کا بادل جاتے کتنی دیر ہے۔.. تو شتابی پوڑے بنالے، دیر نہ کریو۔ گھنا بادل ہووے، بسیرے کے صاحب نے لمبی چھٹی نہ دی، گھڑی کو لوٹے گا۔ جلدی پوڑے بنادے۔"

میں تاں بیٹھی مال پوڑے کا آٹا گھولن۔ باہر بسیرے نے آواج نکال، ملہ واوں کو آلااودل سنانے لگا۔ آواج سن کر میرے تو ہاتھ نہ چلیں۔ پاؤں جمین نے پکڑ لئے۔ دل کی آواج کانوں کو آنے لگی۔

بسیرا جانے کتنے پوڑے کھا گیا۔ ہر بر کی سنگ اُونچے اُونچے بولے "واہ!...." ہم چاروں کھی کھی ہنسنے لگیں۔

جب بسیرا لاہور چلنے کو ہوا تو تاؤ بولا.... "لے بھائی بسیرے! ہم سارے اُجڑ بگڑ کے اِدھر آئے رہے، بڑی بوڑھیاں ہماری مرکھپ گئیں۔ پر سرع میں کیسی سرم۔ تو اپنے مُنہ سے بول، تیں کو کون سی اچھی لگی چاروں ماں سے؟"

بسیرا گھنی دیر چپ رہا، پھر بولا.. "اچھی تو ساری ہیں پر لے تو نے پوچھ ہی لیا تاؤ جمیل تو میں کو اس کا ہاتھ پکڑا جس نے یہ میٹھے رسیلے پوڑے پکائے.. جو کبھی ہاتھ چھوڑ دوں تو بسیرا نام نہیں...." لو جی اس کے بعد تو بیاہ تک سب ہی مجھ کو پوڑے والی پکارا کریں چھیڑنے کو۔ تاؤ کی تینوں دھیاں نے میرا نام جوبیدہ پوڑے آلی رکھ دیا۔

پھر بات تو ادھ میں رہ گئی.... اس بڑھاپے کا ستیاناس مارا جائے۔ کبھی کچھ یاد آوے کبھی کچھ۔ پوری بات خود کو یاد نہ آوے تو تاؤ کو کیا سمجھاویں! ہاں تو تاؤ سن:

دھیاں جنوائی لے گئیوں اور بہواں لے گئیں پوت
او رے، بسیرے جانگلی! تم رہے اوت کے اوت

بسیرے جانگلی کو معلوم ناں جو بہواں نرے پوت ہی لے جاویں تو جان بچے۔ وے تو بیاج، اصل کوڑی کوڑی سمبرلیں۔ پائی نہ چھوڑیں کسی کے ہاتھ.... میں جو آنگن میں چاروں رینگتے کرلاتے بچوں سمیت آئی تو بڑا "ابا ابا" کہہ کر بلکے، سنا نہ جائے۔ جوانی میں بسیرے کی آواج کھڑک دار باجے بھرے ڈھول جیسی ہوا کرے۔ اب تھوڑا گلا بیٹھ گیا، پر اب بھی اس کی آواز میں آلااودل سن کر پاؤں دھرتی سے نہ اُٹھیں۔ رکنا پڑے۔ اندر گھس کر دیکھوں۔ بسیرا بنیان دھوتی پہنے چولہے کے پاس رنگیلی پیڑھی پر بیٹھا گائے۔ اس کا گہرا سانولا گیرو رنگا مکھ چھپر کی چھاؤں تلے خوشی میں دمکتا ہووے۔ سر پر وے نے مہندی لگا رکھی۔ سلور کی بڑی تھالی میں بڑا گول پوڑا لئے چسکوں سے کھائے رہا۔ زنت نے چولہے پر توا چڑھا رکھا میرے جہیز کا۔ نواں توا چولہے پر چڑھائے رہا اور پان کے پتے سے پوڑا برابر کر رہی۔ مجھے دیکھ آنکھیں گاں سے لگالیں۔ چوراں مافق نظر نہ اٹھائے۔ بچے پکوان دیکھ ماں پر لپکے۔ بھول بھال گئے کون سی دادی کیسی دادی! ماں نہ بولے نہ چالے بس پوڑا سدھراتی جائے۔ مجھے دیکھ کرناں بسیرا بولا.. "اِدھر آجا جوبیدہ.... لے ری شتابی آ۔ ہمارے تو بھاگ کھل گئے۔ کیسی سیکھی سکھلائی جنت مل گئی۔ ہم نے تو ساری جندگی پوڑے میں انڈہ نہ ڈالا۔ اس نے سالم چار انڈے ڈالے پھینٹ کر۔ کھا کر دیکھ کیک کا سا مزہ آوے۔ تو بھی سیکھ لے اس سے۔ کیا غضب ڈھائے رہی، ایک سے ایک گول رسیلا پوڑا.. واہ.. واہ"

بچے سب سے پہلے پہنچے۔ پھر میں کود والے کے ساتھ چھپر تلے گئی تو بڈھا بسیرا پھولوں والے روغنی پیالے سے سڑک سڑک چائے پیوے تھا۔ سانولا گیروا رنگ دغ دغ کرے تھا، شام سمے کی سرخی جیسا.. "یہ ساتھ والی کشمیرن سنگ سبز چاہ بنانا سیکھ آئی ہماری جنت.... گھونٹ بھر پی کے دیکھ جوبیدہ.... ہماری تو قسمت جاگ گئی بھلی لوک.... عیش ہو گئے عیش۔ رسیلے پوڑے.... سبز چاہ.... واہ واہ.... واہ وا"

پھر بسیرے نے بڑی چاہت سے میری اور پیالہ بڑھایا۔ وہ تھوڑا بہت لجا گیا....
"لے پی۔ دیکھ جوبیدہ سورگ کا جھٹا ہوئے رہا.."

پل بھر میں میرے پاؤں جمین نہ پکڑیں۔ ساری دیہہ ریت کی بن گئی۔ میں کمرے بھیتر جانے کو چاہوں.... "بس بسیرا میں کوں تاپ چڑھنے کو آوے، لیٹن دے.... ہڈی ہڈی دُکھے آج تو۔"

ان دن سے میں آناڑی کا چولہا چونکا چھوٹا۔ زنت بہو کو کبھی پیاز چھیل دیئے، کبھی آٹا گوندھ پرات دھو دیوار سے لگائے دی۔ سل بٹے پر مسالہ بنائے دیا.... ہاتھاں سے ڈوئی چھوٹ گئی۔ پہلے پہل جھوٹ موٹھ کمر درد سے پڑی رہوں۔ پھر چاروں بچوں کی گھسیٹ اُٹھانے کمر میں درد ٹھہرائے دیا۔ کھاٹ ہی اچھی لگے۔ ہوں ہوں کروں تو آرام آوے۔ پھر بھی بسیرے کا حقہ تازہ کر کے اس کے آگے دھروں۔ ایک دن نیم تلے کھاٹ پر پڑی سوتی رہی۔ زنت نے حقہ تازہ کیا، لال انگارے چلم میں دھرے اور دھو مانجھ کر حقہ بسیرا آگے کیا۔ بس گڑ گڑ کی آواج سن کر جاگی۔ آنکھ کی جھری سے دیکھا۔ مہندی لگے لال لال بال، گیروے سانولے رنگ میں کوئلے دکھیں۔ بسیرا بولا

"واہ جنت تیں اس حقے پر بھی جادو کر دیا...."

"کچھ نہیں گلزارو کے دادا.... گندا تھا، مانجھ دیا۔ چلم میں بھی راکھ بیٹھی ہوئے، وہ بھی جھاڑ دی۔"

"ناں ناں.... مانجھنے سے کوئی خوشبو تھوڑی آنے لگے.... میرا تو سارا سینہ خوشبو سے بھر گیا۔ بھلی لوک گلاب کا تختہ کھل گیا بھیتر...."

"گلزارو کے دادا تھوڑا عرق گلاب ملایا تھا حقہ تازہ کرتے سمے، اس کی خوشبو ہو گی۔" زنت بولی۔

"عرق گلاب تیں کوں کہاں سے ملا....؟" ابھاگا رنگیلا بولا۔

"لے بھول گیا؟ پچھلے بدھ کو لایا نہیں تھا تیں جب گلزارو کی آنکھیں دُکھنے آئیں۔"

"ہاں بھئی ہاں لایا تھا۔ بڑی سگھڑ ونتی ہے تو زنت۔ ساری چیز وستو سنبھال لے، کچھ ضائع نہ کرے.... ہاں جی ہاں لایا تھا، لایا تھا"

تس دن بعد قسم لیتو جو بسیرے کا کوئی کلم میرے جمے لگا ہووے۔ ہولے ہولے زنت نے کٹی پتنگ کی ساری ڈور سمیٹ اپنے کھیسے میں ڈالی۔ لمبے باجو کی آستین میں کلائی

پر چوڑیاں بھی بینت بینت وہی ڈالے تھی۔ صافے کو مایا لگانا، مٹی دھول میں سنی جتی کو صاف کرنا، کاناں کی بالیاں چمکانا سب کام چلتی پھرتی ترنت زنت کر دیتی۔ اور ہر کام میں ستھرائی صفائی سگھڑ پن.... ماں کی کھال اُدھیڑنے کو چاروں روں راں بچے آگے پیچھے رہ گئے۔ بال کھینچیں، دھموکے ماریں، سلیپر چھپادیں، تکیہ گھما کر سر میں ماریں، کھوپری ہل جاوے میں بڑھیا کی.... تس پر نہ مارنے کی اجاجت نہ گھرکنے کی۔ ترسیلا بسیرا ڈھے ڈھے جاوے، رو رو بولے.... "او ری جوبیدہ! ہمارا غمی کا گھر، تیں ان مجلوم یتیموں کو برا بھلا کہہ کر کیوں عاقبت برباد کرنے بیٹھ گئی؟ انتر کو کیا جباب دے گی پاک رسول کوں؟"

دیکھتے دیکھتے میں جوبیدہ سے بڑھیا ہو گئی۔ جب بلاوے بسیرا، بڑھیا کہہ کر آواج دے۔ سوچوں تو میں تو ایسی چھڑیا ہوئے رہی جس کا سہارا لینے والا کھاٹ کا ہو رہے۔ کونے میں کھڑی، جالے میں تنی۔ کبھی نالی کھولنے، کتے بھگانے، بچے دھمکانے، فقیرنی ڈرانے، چھپکلی مارنے کو چھیڑیا اُٹھائی، پھر کرموں جلی کونے میں اچاٹ من کھڑی کی کھڑی۔ بھولی بسری کی کوئی بات نہ پوچھے!

سروع سروع میں جب زنت کو دندل پڑا کرے تو بسیرا ترنت میں کو آواج دے۔ پھر ہولے ہولے وہ خود ہی کافی ہو گیا۔ بسیرا مرے جاہد کو رونے لگتا تو زنت میری بہو آواجیں دے کر بلاتی۔ کچھ دناں بعد اس کوں بھی چپ کرانے کا ڈھب آ گیا۔ چادر تان کر سونا ختم ہو گیا۔ سوکھی ڈالی ہری ہونے لگی۔ زنت پاؤں کی ہلکی، ہاتھ پیر کی چست رہی۔ سارے گھر میں پھرکی سی گھومے پھرے۔ کبھی پنڈلی کھجلائے کبھی سر، کبھی تالی بجائے کبھی چٹکی۔ چلے تو لمبا پراندہ کبھی دائیں کولہے پر کبھی بائیں چاٹتا ہوا.... آواز میں ترنگ، آنکھوں میں لو۔

بسیرے کو رات دن بہو بچوں کی دبدھا، ان کا دھیان.... سارا دن کبھی سکول، کبھی کھلونے، کبھی چاٹ مسالے چارپائی پر دھرے بولے.... "او ری جوبیدہ اُٹھ کچھ ہمت کر بے چاری سارا دن اکیلی جان کھپاوے۔ بھلے جو اس کے گھر والے کل کو سنیں تو کیا کہویں! کوئی نوکرانی تو ناں لائے ناں۔ دو چار برتنوں کو ہاتھ ڈالے تیرے ہاتھ تو نہ گھس جاویں۔"

سرم کی ماری میں بڑھیا اُٹھوں۔ سارا کھرا تھالی کٹوریوں سے بھرا مانجھ مونجھ رکھوں۔ پرات ہانڈیاں دھو بنا ٹھکانے پر رکھے جاؤں۔ بسیرا گھر لوٹے تو جلدی پیڑھی گھسیٹ

کھرے میں جا بیٹھے زنت بی بی۔ بسیرا آگے بڑھے تو لمبی آہ بھرے۔ زنت کبھی مُنہ پر آئی لٹ پرے کرے، کبھی پاؤں دُکھ سے کھجائے۔ گڑیا سی بن جائے، پلکیں جھکائے۔

میں نیم تلے کھاٹ پر لیٹی چاروں بچوں میں گھری.... سوچوں تو زنت کا بڑا دُکھ لگے، نہ سوچوں تو اپنا دُکھ اُٹھائے نہ اُٹھے۔ سارا دن میں مرن ہاری کو نہ جاہد کا غم نہ راج پاٹھ چھن جانے کا روگ.... چار آفتی بچے اپنے بھاگ پھل کو روئیں، میں کو جھنجھوڑیں، توڑیں، مانو پرانی لاش کو گیدڑ.... ہے ہے ماروں تو کٹھور.... لاڈ کروں تو بگاڑنے والی.... سوچوں تو اپنے پر ترس آوے، نہ سوچوں تو اُوپر والے بلوان سے لڑا نہ جائے۔

پھر سردیوں کے دن آئے۔ ٹوٹی پھوٹی رجائیوں میں تن ٹھنڈا رہووے۔ رات پانی کے گھڑے باہر ہوویں تو صبح کہرا جمے ہوئے ان میں۔ ان ہی ٹھٹھرتے دنوں میں زنت کی میا بیٹی سے ملنے آئی۔ وہ بھی ہرن مینارے کے پچھواڑے نئی بستی میں رہووے، تاؤ کی بستی سے میل بھر دور.... کیسری جوڑا، مینڈھیاں گندھی ہوئی.... گلے میں چاندی کا زیور۔ چلے تو پازیب بولے، بیٹھے تو ہاتھی دانت کا چوڑا کھنکے۔ جنوائی اور گھر والا ایک سال مرے، پر وے کہے کوئی مرے ہوؤں کے ساتھ تھوڑا مر جاویں لوگ.... زندہ ہوویں تو زندہ لوگوں کی آگیا لے کر تو نہ جیویں۔ چندن بی بی تو نکھری نکھری جوان، مدھ بھری نجر آئی میں کوں۔ کچھ روج دانتوں میں ماچس پھیرتے، لمبے لمبے ڈکار لیتے، بستی والوں کی باتاں کرتے ہمارے گھر گزری۔ پھر ایک رات جب سارے کمرے میں بند کھاٹوں پر آدھی نیندوں میں ڈٹے رہے ناں تب چندن بی بی کا چوڑا چھنکا۔ وے بھی پلکیں جھکا گالوں سے لگا گڑیا بن جاوے بولے۔

"دیکھ بھائی بسیرا لوکاں کہے ہیں.... بات دل میں نہ رکھو، خمیر لگ جاوے بات کوں" بسیرا چارپائی پر لیٹا حقہ گڑگڑائے۔ ٹھونکے کیل سا اُٹھ بیٹھا.... "چندن بہن! بول بول، کیا بات ہے۔ دل میں نہ رکھ.... یہاں کون سا غیر ہوئے رہا۔"

"چل رہن دے بھائی بسیرا...." پازیب چوڑا سنگ سنگ بولا۔

"ناں اب تو کہہ گزر...." بسیرا بولا۔

سوچوں تو بھلا کوئی عورت بولا کرے اور مرد کے کان نہ سنیں.... نہ سوچوں تو نہ کوئی سنے نہ کوئی بولے، بس ایک رولا پڑا رہووے جگ میں۔

چندن نے ماچس کی تیلی دانتوں میں پھرائی، پھر ڈکرائی اور بولی "جب سے میں آئی رہی، ایک ہی بات دیکھوں بھیا.... کام بہت ہے جنت کو۔ شادی سے پہلے یا کھیلے یا منجا توڑے.... میں مانوں بڑا پہاڑ سا دُکھ ٹوٹے اس پر.... پر تیں بھیا کانچ کی گڑیا کنے پلید بلی بنادی نالیاں میں مُنہ مارنے والی۔ جو تو آگیا دے تو مہینہ دو کو لے جاؤں اُسے.... جرا جان تگڑی ہو جاوے تو لے آنا.... کوئی سدا سدا کو نہ بٹھا رکھوں اپنے پاس۔"

بسیرا چارپائی سے اُٹھا۔ اب تو اس سے بیٹھا نہ جائے "لے یہ چلی جاوے تو ہم بڈھوں کو کون دیکھے۔ جوبیدہ کی تو کمر جباب دے گئی، مردے سمان پڑی رہووے ہے کھاٹ پر.... اب تو چندن اس کا ہمارا ایک پنتھ.... ایک ڈار کے پنچھی کب جدا ہوویں۔ پر جو کوئی تنگی ہو تو بتلا دے، اپنے پلے برابر تو میرا وعدہ پورا زور لگاؤں...."

چندن بی بی کئی کروٹ بیٹھی، پھر ہاتھوں کے کڑا کے نکالے اور آخر کو بولی....

"لے بھائی بسیرا! وہ باقی سب تو جنت کے بس کا ہے۔ کام کاج میں بھی وہ بنیلی ناں.... پر روپے دو روپے کو بھی ہاتھ پھیلانا کبھی ساس آگے کبھی تیرے۔ اس نے تو جاہد موہرے بھی ہاتھ نہ پھیلائے کبھی۔ آخر ہم بھی راجپوت ہوئے رہیں، ہم کو بھی آن نے مارا.... لے تو انصاپھ کر دے۔ روپے دو روپے واسطے کوئی ہاتھ جوڑتا ہے۔ جمانہ بدل گیا بسیرا۔ آج کون گھر کا خرچ مانگے روج روج.... سارا سال؟"

"لے یہ بات ہے تو اس کا پھکر نہ کر چندن.... میں ساری پنسن جنت کے ہاتھ پر رکھوں ہوں آج کے بعد.... لے تو لمبی بات چھوڑ۔ میں کل ہی پنسن چڑھاؤں جنت کے نام۔ آپی لاوے، آپی خرچ کرے.... ہم دونوں کو کیا لینا ہے پنسن سے۔ کیوں بڑھیا؟ دو وخت کی سوکھی روٹی بھی دے تو دُعا پاوے.... ہمارا کیا کام پنسن سے۔ لے میں ٹنٹا ہی مکاؤں۔ آج سے پنسن تیرے نام ہوئی زنت.... کھلا لا.... سب کو کھلا۔ اللہ اللہ کھیر سلا۔"

لے اب تاؤ کو کیسے بتلاؤں!.... ساری عمر میں کو پتا نہ چلا کہ بسیرے کی تنخواہ کتنی ہووے۔ ریٹائر ہوئے پر پنسن نہ دکھائی کبھی۔ روپیہ دس روپیہ اکٹھے دنے دیتا۔ گھر چلتا جائے قطرہ قطرہ قدم قدم.... کبھی پچاس روپے کا نوٹ بھی نہ دیا کھسی ساتھ اور پنسن بہو کے نام لکھوانے پر راضی خوش.... تھرکتا پھرے!

ابھی گھر پر جاگ نہ ہوئی تھی۔ میری کھاٹ پر چاروں بچے اُوندھے سیدھے پڑے

ہوویں۔ رات کو نیم تلے چٹائی بچھا میں کچھا مچھا پرانی دری اُوڑھ سوئی۔ ابھی اذان نہ ہوئے تھی۔ میں خرچ کے بچے پیسوں کو جوڑا۔ بائیس روپے کی اٹھنیاں چونیاں چراگ کے پاس طاق میں رکھ دیں۔ اپنے دو جوڑے گٹھڑی میں گانٹھے، ہرا دروجا کھولا.... اور تاؤ جمیل پاس منسراج کے پچھواڑے میو لوکاں کی بستی میں آ رہی۔

تاؤ جمیل نہ پوچھا کب آئی، کب جائے گی۔ تاؤ کبھی سوالاں میں پڑا ہی ناں.... بس کوٹھڑی کھول کر بولا.... "تیں کو جب تک رہنا ہو، رہووے جا جویدہ، پر تیری آنکھ بتاوے تیں بسیرے پاس جانے والی ناں۔ جو میری مانے تو شام کو واپس لے چلوں۔ میرے سامنے بسیرا اُونچا سانس نہ لے۔ پر جو الاد بن ماں باپ پلے، وے کی آنکھ میں کٹھور تا ہووے تیرے جیسی.... ہیں بھلی لوک تیں اپنا جاہد بھی یاد ناں، تیں بہو کا ساتھ کیا دیوے؟ میو جاتی کی سوانیاں تو بھولے سے بھی گھر والا نہ چھوڑیں.... یہ نئی مٹی کا اثر ہووے، زمانہ ہی بدل گیا.... نئی رت نئی دھرتی.... تیری نجر تو تلوار بھئی.... لے لیٹ جا، میں روٹی لاؤں۔"

میں تاؤ کو کیا جباب دوں؟ کھاٹ پر ڈھیر ہوئی رہی۔

سوچوں تو ساری دُنیا اندھیر ہو گئی، نہ سوچوں تو سارا بدن ہولے ہولے سینک دے، اندر کا سوچنا بند ہو جاوے۔ ایسے ویسے میں کئی سال گزرے۔ میں لو ملنے بسیرا ایا آتا، وے تو تاؤ کو دیکھنے بھی نہ آیا۔

سالوں پیچھے بارشوں میں ہرن منارے کی دیواراں ماں دراڑیں پڑ گئیں، پر سرکار کو سالاں بعد کھبر ہوئی۔ اس کے کارندے آئے، باہر کی دیوار تو تھمبو کر کے اساری۔ پر منسراج کی لاٹ سے جو اینٹیں گریں، ان کا کسی کو ہوش ہی ناں۔ اینٹوں پر بکریاں چڑھیں، گدھے رینگیں۔ مرے ہرن کا جو سینک ہووے تو مرے راجہ جہانگیر کو.... پڑھی لکھی سرکار کنے کون ہرن؟.... کون راجہ؟ من سراج کی لاٹ ساری ڈھے جاوے تو سرکارے دربارے خبر نہ پہنچے۔

سوچوں تو آدمی کا من بھی زمانہ ہے، جو بھول بھال جائے تو پچھلیاں باتاں خواب میں بھی نہ آویں.... کون جویدہ کیسی جویدہ؟.... پر جو نہ سوچوں تو اپنا پچھلا وقت لمبی پرچھائیں بن کر ساتھ رہے.... اُٹھوں بیٹھوں سوؤں ساتھ رہے.... نجر سے اوجھل ہو تو خواب میں گھس جاوے۔

سال گزرے پر تاؤ نہ پوچھا کب آئی، کب جائے گی۔ ایک دن تاؤ کی منجھلی بھی اُجڑ کر آ رہی تو اُسے کوٹھڑی کا دروجا کھول کر اندر کرتے تاؤ بولا.... "پتہ نئیں جمانہ بدل گیا کہ ایدھر کے دانہ پانی میں کچھ ہے۔ کچھ موسم بدل گیا، میرے گھر کی لڑکیاں کٹھور ہو گئیں۔ منجھلی کی آنکھ بھی جویدہ جیسی کٹھور ہو گئی۔ تیں سے تو بسیرا اچھا جویدہ، ساری پنشن زنت کے نام لگوا دی.... کھد بنک جاوے زنت، کھد پنسن لاوے۔ سنا ہے ایک کوڑی کبھی نہ مانگے بہو سے.... مرے بیٹے کا حق ادا کر دیا۔ سنا ہے چار میل پر بچوں کا سکول ہے۔ کھد چھوڑنے جاوے، کھد لینے۔ سب سے کہتا پھرے ہے میرے جاہد کا دُکھ زنت کے دل سے ڈھل جائے تو سمجھ لیئو میں جیتا بچا۔ زنت کے بچے پل جاویں، لکھ پڑھ جاویں تو جان لیئو بسیرا مکت ہوا...."

اب تاؤ جمیل کو کیسے بتلاویں ساری عمر ایک دن پوری تنخواہ ہتھیلی پر نہ رکھی بسیرے نے تو پنسن ہوئے پر کیسی پنسن؟ کس کی پنسن؟ جو روئیں تو کس کے آگے، نہ روئیں تو سارا بدن آنسو بن جاوے۔ جی میں اِک کھیال رہووے تھا کہ آج بسیرا آوے گا.... صبح کی شام کروں، شام کی صبح.... کہیں دھیان میں اِک بسواس تھا کہ جیسے میرا جاہد تنگ تھا زنت کے ہاتھوں ویسے ہی بسیرا بھی تنگ آ جاوے کہیں۔ پر مرد جات جو پہلی سنگ نہ کریں وہی دوجی ساتھ جرور کریں۔ دوجی کا لاڈ نخرا جرور اُٹھاویں۔ تاؤ جمیل بتائے رہا قرض اُٹھا کر بسیرے نے چاندی کی جُگنی بنا دی زنت کو.... بے رت کی سبزیاں لائے بسیرا.... کپڑا بھی زنت ریشمی پہنے، ناک میں لونگ بھی ڈال رکھے.... میرے جاہد سنگ زنت مرنے تھوڑا لگی ہووے.... چندن ٹھیک کہوے تھی۔

جب تاؤ کی تینوں اُجڑ کر کوٹھڑی میں آ بسیں تو سردی کی ایک رات تاؤ کمبل کی بکل مار دہلیز میں آ بیٹھا۔ دیر تلک گڑگڑی پیتا رہا۔ پھر ہرے چاند کو دیکھے آہ بھری اور بولا.... "پتہ نہیں یہاں کی مٹی میں کچھ ہے یا پھر جمانہ بدل گیا.... تم چاروں کی نجر کٹھور ہوئی۔ جو تم چاروں میں سے ایک بس جاتی تو منے تمہاری تائی کا غم بھولے۔ پر آدم زاد کا کیا ہے.... اللہ کی مٹی میں شیطان کا خمیر.... پھولے ہی پھولے وقت کے ساتھ ساتھ....

لو سنو میری جائیو.... اور تو بھی سن میرے بھائی کی اکلوتی نشانی جویدہ! جب میو جاتی ادھر کو چلے تو پتہ نہ تھا کدھر جائے ہیں اور کاہے کو جائے ہیں۔ راستے میں تین بیٹے

میں گنوائیں۔ جوبیدہ کے ماں باپ گل کپتان نے ڈھیر کر دیے۔ ادھر آئے تو ہانک کر لوگاں نے شیخوپورہ میں لا ڈالا۔ یہ جو سامنے ہرن مینارہ نجر آوے تو یہ شکار گاہ ہوا کرے راجہ جہانگیر کا.... جب بادشاہ کشمیر جاوے ادھر ٹک کر شکار کھیلے۔ ادھر کوئی بستی شہر نہ ہووے تب، جنگل اُجاڑ۔ بڑے لوگاں کی بڑی باتاں .... بادشاہ کے پاس ایک کالا ہرن ہوا کرے، ریشمی کھال والا کالا چیتل.... ہرن پر راجہ کی نجر ٹکی رہووے۔ پل کو جدا نہ ہووے۔ ساتھ ساتھ رکھے چیتل من سراج کو۔ ہرن بھی چوکس، چونچال۔ کبھی قدموں میں لوٹے، کبھی نجر کا بان چلاوے.... ایک دن صبح سویرے راجہ جہانگیر سکار کو نکلا۔ سنگی ساتھی ساتھ بندوق اُٹھائے۔ رانی نور جہاں گھوڑے پر سوار۔ صبح ابھی اندھی رہی، جیادہ روشنی نہ ہوئے تھی۔ بس آدھی روشنی ماں تارے آنکھیں ماریں۔ جنگل بیابان.... ایک ہرنوں کی ڈار گجری، راجہ جہانگیر نے بندوق داغی۔ سارے ہرن بھاگ رہے، ایک ڈھیر ہوا.... گھوڑے دوڑائے سنگی ساتھی بھاگے۔ خود راجہ سکار تک پہلے پہنچا تو میری جائیو!.... اور میرے بھائی کی آکھری نشانی سن! اپنی گولی سنگ راجہ نے لے پالک من سراج ڈھیر کر لیا۔ راجہ نے سینہ پیٹ لیا۔ کشمیر جانے کا کھیال بھولا۔ خود اُٹھا کر ہرن منارے اپنا من سراج کوں...."

منجھلی نے گرمی کھائی۔ پتہ نہیں مٹی کا اثر ہوئے رہا کہ جمانہ بدل گیا۔ وے بولی .... "ناں ابا تیں کو غلتی لگ رہی۔ من سراج گولی سے نہ مرا۔ وے تو بہت دیر بیمار رہا۔ بڑے حکیم بید آئے، آخر کو مر گیا...."

تاؤ جمیل بھی گرمی کھائے رہا، بولا.... "تیں کو جیادہ پتہ ہے کہ ماں کو؟ جیادہ پتہ رکھنے والیاں لوٹ آویں ہیں گھر کوں۔ گولی لگی جب بین اس گھڑی منسراج کے مُنہ سے آواج نکلی.... دُکھ بھری۔ سنا ہووے جب کالا سیاہ چیتل مستی میں ہووے ناں تب ایسی آواج نکالے۔ بھلا راجہ آواج نہ پہچانے اپنے چیتل کی۔ مرن ہارا بھی دُکھ میں نہ رویا.... مستی میں رویا۔ راجہ نے من سراج کو سینے سے لگا کر بین کیا.... لے بھائی مرنا کوئی تیرے سے سیکھے.... پریم میں نہیں کٹانا تو کچھ اور ہی مجا دے.... اپنے پیارے کے ہاتھوں مرنا تو ہر ایک کے بس کی بات ناں.... پر تم چاروں کو کیا پتہ.... من سراج کا بین کیا تھا!"

منجھلی چاند اوجھل ہوئے پر بھی لڑے تھی کہ تاؤ گلط کہانی سنائے رہا۔ پر میں باہر

نکلی۔ بستی کے گھروں سے نکل کر من سراج کی لاٹ اور بھاگے گئی۔ ساری سیڑھیاں ایک ہی سانس میں چڑھ گئی۔ آخری جھروکے ماں سے ہرن مینارہ نجر آوے سارے کا سارا۔

اس سمے ماں بھیتر سے ایک بین نکلا.... میں اُونچے روئی پہلی بار "او میا تیں نے راہ میں گردن کٹائی۔ بیٹی کی کوئی سدھ نہ لی۔ جو کہیں میں کو پوڑے پکانا ہی سکھا دیتی تو میں بسیرے کے ہاتھوں نہ مرتی.... اپنے کے ہاتھ سے مرنا کتنا مسکل کام ہے.... یہ تیں کوں کیا پتہ ماں...." میں ابھاگن کی چیخ دور راجہ جہانگیر کی سکار گاہ تک سسکارتی گئی۔

دن چڑھے بستی سے اجان کی آواج آئی تو میں لوٹی۔ کھاٹ پر لیٹن لگی تو میں کوں منجھلی نے بتایا تاؤ تو آدھی رات کا میں کو ڈھونڈن نکلا ہووے۔ لو جی اس رات بعد نہ تاؤ ملا نہ اس کی پرانی لالٹین۔ بہت ڈھونڈن نکلے بستی والے پر تاؤ ہم چاروں سنگ نہ پھٹکا۔ گاؤں والے بولیں جس رات منسراج کی لاٹ میں ہرن کی آتما آوے، چیتل مستی میں دُکھ بھری آواج نکالے وے رات کوئی مسافر رستہ بھولے۔ سوچوں تو کبھی کبھی من کا دیا بڑی آندھی میں نہ بجھے.... اور نہ سوچوں تو من سراج کے مُنہ کی آئی ہائے جندگی کی آس بجھا دے.... سوچوں تو تاؤ میری چیخ پہچان کر نکلا ہووے، نہ سوچوں تو لگے تاؤ جمیل کا گھور اندھیرا اسے اوجھل کرے ہم سے.... اس کے من کا چراغ سالوں پرے بجھ گیا تو وہ کیسے گھر ڈھونڈے اپنا۔ لو جی آدمی جب بھی چلے اپنے من کے اُجالے ہی میں تو چلے ناں؟....